ترجمہ نامہ ہائے فارسی غالبؔ

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◇◇◇◇◇◇◇◇◇◇◇-----

نقشِ نیم رُخ

ترجمہ نامہ ہائے فارسی غالبؔ

انتساب

محبِّ گرامی قدر مُشفق خواجہ
عزیزہٗ با اخلاص آمنہ مُشفق
بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

NAQSH -E -NEEM RUKH

By:

Dr. TANVEER AHMED ALVI

نام کتاب : نقشِ نیم رُخ

بہ اہتمام : شاہد ماہلی

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد عمر کیرانوی

سالِ اشاعت : ۲۰۰۲ء

قیمت : ۱۲۰؍روپے

مطبوعہ : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

حرفِ آغاز

''نامہ ہائے فارسی غالب'' کا اُردو ترجمہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ غالبؔ کے فارسی مکتوبات کی ترجمہ نگاری کے سلسلے میں یہ میری دوسری کوشش ہے۔ نقشِ ثانی اوّل سے بہتر ہو یہ ضروری نہیں۔

نقشِ اوّل غالب کے فارسی خطوط (مشمولہ پنج آہنگ) کے ترجمے پر مشتمل تھا۔ اس میں متفرقات غالب کے بعض مکتوبات کا ترجمہ بھی شامل ہے اس مجموعے کو دہلی اُردو اکادمی، (دہلی) نے ''اوراق معانی'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا تھا اسی وقت سے میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ میں ''نامہ ہائے فارسی'' غالب کا بھی ترجمہ کروں۔

اس کے لیے میں نے محبّی سید علی اکبر ترمذی سے، جو نامہ ہائے فارسی کے مرتّب و مدوِن ہیں، اجازت طلب کی، موصوف نے ازراہِ خلوص و محبّت میری اس خواہش کو قبول کیا اور یہ فرمایا کہ ان خطوط کو آپ نقش اول کا ''ضمیمہ'' نہ بنائیں۔

ان کی منفرد اور مستقل حیثیت باقی رہنی چاہیے۔ اسی لیے ''نقش نیم رُخ'' کو ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے جس کے لیے میں بطورِ خاص، غالب انسٹی ٹیوٹ، اس کی مجلسِ اِشاعت کے معزز اراکین اور بالخصوص مکرمی و محترمی پروفیسر نذیر احمد کا تہِ دِل سے شکر گزار و ممنوں ہوں جنھوں نے اس کی اشاعت کی منظوری دی اور پروفیسر موصوف نے از راہِ نوازش اُسے شروع سے تا آخر ملاحظہ فرمایا اور مجھے اپنے گران قدر مشوروں سے نوازا۔ غالب کے جو خط بشکل ترجمہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان مکتوبات میں غالبؔ کا جو خوب صورت ادبی اسلوب سامنے آتا ہے ترجمے میں اسے کس حد تک باقی رکھا جا سکا۔ اس کے بارے میں راقم الحروف کے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔

''نقشِ نیم رُخ'' کے طویل مقدمے میں ان خطوط کے مطالعے کے ماسوا اس فاضلانہ مقدمے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جو ترمذی صاحب موصوف نے بزبان انگریزی نامہ ہائے فارسی میں شامل کیا تھا۔ اس کے لیے میں ترمذی صاحب کا علمی اور ادبی طور پر تہِ دِل سے ممنون ہوں۔ اس ضمن میں بطورِ خاص مجھے غالب انسٹی ٹیوٹ اور اس کے کارپردازوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے خصوصیت کے ساتھ شاہد ماہلی اور اقبال مسعود جنھوں نے اس کی اشاعت سے خصوصی دلچسپی لی اور محمد عمر کیرانوی نے اس کے مسودہ کی صفائی اور نگارشِ متن میں میری مدد کی۔

ت۔ا۔ع۔

فہرست

۱۵۔ حضرتِ قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

۱۶۔ حضرت قبلہ گاہ وحضرت ولی نعمت مدظلہ العالی

۱۷۔ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی ، مدظلہ العالی

۱۸۔ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی ، مدظلہ العالی

۱۹۔ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی ، مدظلہ العالی

۲۰۔ خان مہربان سلامت

۲۱۔ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

۲۲۔ قبلہ گاہی

۲۳۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ کونین وکعبہ دارین

۲۴۔ میرے قبلہ گاہ، میرے ولی نعمت

۲۵۔ قبلہ گاہ من

۲۶۔ مآثرِ غالب

پیش لفظ

غالبؔ نے اپنی تاریخ حیات کا یہ سفر ۱۸۲۵ء کے اواخر یا ۱۸۲۶ء کے اوائل میں شروع کیا یہ سفر اُن کے ذہن اور زندگی میں کئی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کے دوران وہ پہلے فیروز پور (جھرکہ) پھر لوہارو گئے بعد ازاں دہلی کی طرف رخ کیے بغیر کانپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے وہاں پانچ ماہ کچھ دِن قیام رہا۔ لکھنؤ کے بعد اُن کی منزل سفر باندا قرار پائی۔ باندا سے روانہ ہوئے تو اِلہ آباد، بنارس اور مرشد آباد سے گزرتے ہوئے کلکتہ پہنچے جو اس زمانہ میں انگریز کمپنی بہادر کے حکمرانوں کا مرکز حکومت تھا۔

اس اجمال کی ایک گونہ تفصیل اس طور پر بیان کی جاسکتی ہے کہ غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد اُن کے وارثان کے لیے انگریز کمپنی بہادر کے حُکّام کی طرف سے جو پینشن مقرر کی گئی تھی اس سے متعلق

دستاویزات میں غالبؔ کے نقطۂ نظر سے کچھ ایسی غلط اندیشی اور کج روی راہ پا گئی تھی کہ انہیں جو پینشن ملتی تھی وہ ان کے جائز خاندانی حق سے بہت کم تھی۔

شادی کے بعد اخراجات بڑھے ہوں گے نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ اُن کے خسرِ محترم خانہ داماد کی حیثیت سے اُن کی جو سرپرستی فرماتے رہے ہوں گے وہ بھی رفتہ رفتہ اور خاص طور پر اُن کی وفات کے بعد ختم ہوگئی ہوگی۔

غالب کے اخراجات، امیرزادوں اور خاندانی رئیسوں جیسے تھے اسی نسبت سے قرض داری کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا جو شدہ شدہ پریشان کن صورت اختیار کرگیا۔ جس کا کچھ اندازہ اُن کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔

پینشن کے معاہدے میں بطور خاص، نواب احمد بخش خاں، برادر والا قدر نواب الٰہی بخش خاں شریک تھے جو مرحوم نواب نصراللہ بیگ خاں کے برادر نسبتی تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک بہادر کے ساتھ مل کر اُن عسکری مہمات میں حصہ لیا تھا جو دوآبہ کے علاقہ میں انگریزی اقتدار کی توسیعات کا باعث ہوئیں۔

غالب نواب صاحب سے ملاقات کے لیے فیروز پور جھرکہ روانہ ہوئے۔ نواب صاحب بھرتپور میں اُن انگریز افسران کے ساتھ تھے جن کی سرکردگی میں انگریزی افواج نے قلعۂ بھرتپور کا محاصرہ کررکھا تھا۔ غالبؔ نے نواب صاحب کی واپسی کے وقت تک وہیں قیام کیا۔ پھر نواب مُعلی القاب کی مراجعت فرمائی کے بعد فیروز پور جھرکہ پہنچے۔

نواب صاحب سے کوئی اطمینان بخش واُمید افزا جواب نہ پا کر انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ وہ اس کی چارہ جوئی اور دادخواہی کے لیے کمپنی کے نظما اور سربراہانِ کونسل

وگورنر جنرل سے رجوع کریں۔ وہ دہلی واپس نہیں آئے کہ۔ قرض خواہوں کی گیر و دار سے دامن کش رہنا چاہتے تھے۔

انہوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا اثنائے راہ میں کانپور ٹھہرے یہاں پہنچ کر بیمار ہو گئے کچھ افاقہ کی صورت ہوئی تو لکھنؤ پہنچے پانچ ماہ کچھ روز یہاں قیام کیا۔ بعض اہل دربار اور بہت سے سربرآوردہ افراد سے ان کی ملاقاتیں رہیں اس نئے شاہی شہر نے ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیے لیکن ان کی خاطر خواہ پزیرائی وقدر افزائی نہ ہوئی جو دراصل لکھنؤ آنے کا باعث تھا۔

ہوس سیر وتماشا تو بہرحال نہ تھی اور اگر تھی بھی تو بہت کم یہاں وہ مولوی کرم علی اور مولوی سبحان علی جیسے ممتاز افراد سے ملے حلقۂ تعارف آگے بڑھا جواُن کی ادبی فتوحات میں بھی معاوِن ہوا۔ معتمد الدولہ آغا میر کے لیے انہوں نے قصیدہ لکھا اور ''صنعت تعطیل'' میں ایک نثر پارہ ترتیب دیا لیکن ملاقات مصافحہ اور مُعانقہ کی نوبت نہ آئی غالبؔ ان درباردارانہ آداب ورسوم سے وابستہ شرائط کو پورا نہیں کر سکے۔ جو اس طرف سے عائد ہوئیں تھیں ایسی صورت میں رئیس اودھ یا (نواب وزیر) یا شاہ اودھ سے ملاقات کیسے ممکن ہوتی۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ ''کششِ کاف کرم'' ہے ہم کو

کششِ کاف کرم کا ایک حلقہ ''باندا'' تھا جو اسی نام کی ایک چھوٹی سی ریاست کا صدر مقام بھی تھا۔ یہاں خاصے لمبے عرصہ تک اُن کا قیام رہا۔ باندا میں وہ مولوی محمد علی خاں صدر امینِ ریاست کے مہمان تھے۔ یہاں کے زمانۂ قیام میں جو

تعلقات ہوئے وہ استواری کے ساتھ مولوی صاحب کی زندگی تک قائم رہے۔

مولوی محمد علی نے غالبؔ کو نواب علی اکبر خاں طباطبائی مہتمم وقف امام باڑہ ہگلی کے نام تعارفی خط دیا۔ نواب صاحب ایک عالی خاندان رئیس۔ اور اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے ایک قابلِ احترام شخص تھے، غالبؔ ان سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔ یہ ''تاثر'' مخلصانہ تعلقات میں بدل گیا۔

غالبؔ نے فارسی زبان میں اُن کو متعدد خطوط لکھے ایک سے زیادہ دل چسپ خط پنج آہنگ اور نامہ ہائے فارسی دونوں مجموعوں میں شامل ہیں۔

غالب باندے سے جب دیار مشرق کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں چلہ تارا اور مودہا میں ان کو رکنا پڑا، رہگزار سفر کی ان بستیوں میں سفر کے دوران اُن کو ایک خاص طرح کی چھکڑے نما سواری میں بھی سفر کا اتفاق ہوا جسے مقامی زبان میں ''لڑھیا'' کہا جاتا تھا ممکن ہے اب بھی کہا جاتا ہو غالبؔ اُسے ''گردونکہ'' کہتے ہیں یہ بے حد آہستہ رفتار سواری ہوگی تبھی تو غالب نے اُسے ''آہستہ خرام بلکہ مخرام'' کہا ہے۔

انہیں مواضع میں قیام کے دوران غالب نے محکمہ پولیس کے داروغہ کے وسیلہ سے ڈاک کی روانگی کے سلسلہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں سے آگے بڑھ کر وہ اِلہ آباد اور پھر بنارس گئے اس وقت کا شہر اِلہ آباد اپنی شہری آبادی انتظامی اُمور اور قیام کی سہولتوں کے اعتبار سے انہیں پسند نہیں آیا اور بنارس کی خوبیوں اور وہاں کی تہذیبی خوبصورتیوں سے وہ گہرے طور پر متاثر ہوئے ہجوالہ آباد اور وصف نگاری بنارس کے سلسلہ میں جو باتیں ان کی زبان قلم پر آئیں وہ

ادبیات غالب کا حصہ بن گئیں۔

انہوں نے ''چراغِ دیر'' جیسی دل آویز مثنوی میں اس شہر خوبان وصنمستان برہمنان کی تعریف کی اور اپنے پیش رو مرزا عبدالقادر بیدلؔ کی یاد تازہ کی کہ بیدل بھی دل دادۂ بنارس تھے۔

غالب اگر چہ اس سفر میں گوناگوں اسباب، کی بناء پر صحت کی خرابی اور آلام روزگار کا شکار رہے پھر بھی ان کا قلم ایک فطری اپج اور تخلیقی سرجوش کے ساتھ گل افشانیاں کرتا رہا اور اس سفر در سفر کے زمانہ میں بھی ادب پارے معرض وجود میں آتے رہے۔

غالب کے سفر وحضر کی جو روداد اُنکے فارسی مکتوبات میں ملتی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کہ ان جیسے کسی مسافر راہ کے لیے وسائل سفر کیا تھے۔ کبھی اسپ راہوار پہ سفر ہوتا، کبھی کشتیوں میں۔ کشتیانوں اور اسپ داروں کا رویہ کہاں کیا رہا اس کی طرف بھی اشارے موجود ہیں۔ آب راہوں سے گزر اور رہ گزاروں میں سفر کی کہانی کے کچھ ٹکڑے۔ غالبؔ کی روداد حیات کا حصّہ ہے۔

موجودہ مکتوبات میں عظیم آباد اور مرشد آباد جیسے شہروں سے متعلق وہ تفصیلات یا کچھ جزئی باتیں نہیں ملتیں جو اُن تاریخی شہروں سے متعلق وقت کی کسی تصویر گزراں کو پیش کر سکیں۔ غرض کہ بنارس سے کلکتہ تک عجب صورت رہی۔

کچھ عجب حالت ہے راہ منزل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا

کلکتہ پہنچنے سے پیشتر ہی غالبؔ کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ ان کی بیگم کے عم

محترم فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا۔ جس کی مزید تصدیق کلکتہ پہنچ کر ہوئی۔ غالبؔ نے اس پر اظہارِ ملال کیا اور اس کے باوجود کیا کہ پینشن کے مقدمے کی ساری پیش رفت اور بنیادی دستاویزوں کی کج داریاں انہیں کی پیدا کردہ اور ''درمیاں آوردہ'' تھیں۔ کہ نواب نصراللہ بیگ خاں کی اچانک وفات کے بعد وہی خاندانی معاملات کے سربراہ تھے۔

غالبؔ کے کلکتہ پہنچنے کی تاریخ خود ان کے ایک خط میں بہ ایں تفصیل موجود ہے۔ ''روز چہار شنبہ چہار شعبان چہار پہر از روز برآمدہ در کلکتہ رسید''۔

.....

''نامہ ہائے فارسی'' میں جو خطوط شامل ہیں ان میں سے بعض کے مخاطب یا مکتوب الیہ وہی افراد ہیں جن کے نام پنج آہنگ میں بھی خطوط ملتے ہیں اور جو خطوط قدرِ مشترک کا درجہ رکھتے ہیں ان میں کہیں کہیں اختلافِ عبارت اور لفظیات بھی ہے۔

ممکن ہے غالب نے پنج آہنگ میں شامل خطوط کو اشاعت کی غرض سے دیتے وقت..... ان پر نظر ثانی بھی کی ہو اور دونوں میں جو اختلافِ روایت ملتا ہے اس کی وجہ یہی ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ خطوط کی نقل کے وقت کاتبوں کی طرف سے ضروری احتیاط نہ برتی گئی ہو۔ مگر کاتب زیادہ تر لفظ بدل دیتے ہیں عبارتیں نہیں بدلتے اب جو بھی صورت ہو۔

غالب کے بعض فارسی خطوط جو مختلف مآخذ سے جمع کیے گئے ہیں ان کو ''متفرقاتِ غالب'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے اس نام کے ساتھ شائع ہونے

والے فارسی خطوط کے مرتب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ہیں۔

حکیم حبیب الرحمٰن آف ڈھاکہ کے ذاتی ذخیرے (Private Callection) سے جو غالب کے فارسی نامے حاصل کیے گئے تھے انہیں قاضی عبدالودود نے آثارِ غالب کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

یہ خطوط بھی اس زمانے میں تحریر ہوئے تھے جب غالب کا قیام کلکتہ میں تھا یہ نگارش نامے کن لوگوں کو لکھے گئے تھے ان کے نام ان کے ساتھ موجود نہیں لیکن فاضل مرتب کے خیال سے یہ قرین قیاس ہے کہ یہ مرزا احمد بیگ تپاں خواجہ محمد حسن، اور فیاض الدین حیدر کو لکھے گئے ہوں۔

یہ خطوط جو ''معاثرِ غالب'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں ان میں غالب کی بعض ایسی شعری تخلیقات بھی شامل ہیں جو ان کے معروف شعری مجموعوں میں نہیں ملتیں۔

بہر حال اس وقت تک غالب کے جن فارسی مکتوبات تک ہماری رسائی ہوتی ہے ان میں، اس مجموعہ خطوط کی وجہ سے کہ قومی محافظ خانے National Archives میں دریافت ہوا تھا ایک گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔

National Archives نے اسے سید محمد رفیع سے خریدا تھا جو تاریخی شہر کٹرا الہ آباد کے رہنے والے تھے ترمذی صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> The manuscript of this collection was acquired by the National Archives of India, as early as 1960, from Sayyid Mohammad Rafi Naqvi of Kara, the Historic town in Allahabad District, Uttar Pardesh. to which place late any Sayyad Ali Hasan Khan who had transcribed these letters as stated in

English at the end of the menuscript . It is however not known exactly when this collection was compiled, and copied but in all probability it must hav been transcribed about 1839.

ان خطوط کو کب جمع کیا گیا یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی لیکن جیسا سید افضل علی تحصیل دارِ بدوساو(کالنجر) کے خط مورخہ ۱۵/اگست ۱۸۳۹ء سے پتہ چلتا ہے۔ان خطوط کی ترتیب ۱۸۳۹ء ہی میں عمل میں آئی ہے یہ خط سید علی حسن خاں کو لکھا گیا تھا جو باندہ ڈسٹرکٹ میں رہتے تھے۔

یہ سید علی حسن خاں کون تھے یہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن جیسا کہ دوسرے شواہد سے معلوم ہوتا ہے وہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کا تعلق باندہ کے انتظامیہ سے تھا جو بھی صورت ہو غالب کے بیشتر خطوط جو اس مجموعے میں موجود ہیں مولوی محمد علی خاں صدرِ امین۔ باندہ کے نام ارسال کیے گئے ہیں۔ایسی صورت میں باندہ ہی میں کہیں انہیں جمع بھی کیا جانا چاہیے۔

یہ مخطوطہ ۳۳/اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۱۸سطریں ہیں اور ان کی تقطیع ''۷×۱۰'' ہے اس میں کل ۳۴ خط ہیں جن میں ۳۲ غالب کی اپنی تحریریں ہیں لیکن ان کے قلم سے نہیں باقی دو خط وہ ہیں جو منشی علی حسن خاں کے دوست نے ان کو لکھے تھے اس مخطوطے میں دو نثری تحریریں ایسی ہیں جن کا تعلق اس ادبی نزاع سے ہے جو غالب کو کلکتہ میں پیش آیا تھا۔

یہ مخطوطہ خط شکستہ میں لکھا گیا ہے، روشنائی سیاہ ہے اور اس کا کاغذ دست ساز ہے جگہ جگہ سے کرم خُوردہ ہے ترمذی صاحب نے ان کرم خوردہ مقامات کو غالب کی کلیات نثر کے نسخوں کی مدد سے سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش کی ہے لکھا ہے ''جہاں میں

ان نسخوں سے مدد نہیں لے سکا وہاں نقطوں سے اس کی نشاندہی کر دی ہے کہ یہ حروف پڑھے نہیں جا سکے یا پھر یہ مخطوطے میں موجود ہی نہیں ہیں''۔

ترمذی صاحب نے دو طرح کے نشانات شمار ان خطوط میں دیے ہیں ایک وہ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخی ترتیب میں یہ خط کہاں آتا ہے دوسرے یہ کہ مخطوطہ میں یہ کہاں ہے۔ یہ نشاناتِ شمار اوپر درج ہے اور manuscript میں اس کا نشان کہاں ہے۔ یہ نیچے ہے۔

۱۹۶۹ء میں اسے مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ اس مجموعے کی اشاعت ''غالب اکیڈمی'' کی طرف سے عمل میں آئی۔ اب یہ اشاعت بھی نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ فاضل مُرتب ترمذی صاحب نے اس کا PREFACE اور INTRODUCTION انگریزی میں قلم بند کیا ہے۔

اس اشاعت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا مختصر ''پیش لفظ'' بزبان انگریزی معروف محقق قاضی عبدالودود نے تحریر فرمایا ہے۔

خطوط کے اس مجموعے کا (مخطوطہ) اپنی اشاعت سے نو برس پیشتر National Archaeves میں دریافت ہوا تھا۔ ترمذی صاحب نے اس کی اطلاع قاضی عبدالودود کو دی جو غالبیات کے ایک بڑے ماہر شخص تھے انہیں کی فرمائش پر اس مخطوطے میں موجود بعض خطوط ریسرچ جرنل تحقیق میں شائع ہوئے۔ بعدازاں غالب صدی کی آمد کو ذہن میں رکھتے ہوئے خود ترمذی صاحب سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اسے مرتب کر دیں اور ایسا ہی ہوا بھی۔

ترمذی صاحب کو اس کی ترتیب و تدوین میں جو دشواری پیش آئی انہوں نے

اپنے "Priface" میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''ان خطوط پر مشتمل کوئی دوسرا قلمی یا مطبوعہ نسخہ موجود ہی نہیں۔ اس لیے تقابلی مطالعہ ممکن نہ تھا۔ مخطوطہ بھی جس اندازِ نگارش کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے وہ خطِ شکستہ سے بہت قریب ہے اس لیے اس کی خواندگی میں دشواری پیش آئی اس دشواری میں کچھ اور اضافہ اس لیے ہو گیا کہ جگہ جگہ سے مخطوطہ کرم خوردہ ہے۔'' آگے چل کر فاضل مرتب نے لکھا ہے:

''ان خطوط کو تاریخی ترتیب سے جمع نہیں کیا گیا
میں نے یہ چاہا بھی کہ ایسا ہو جائے لیکن اس میں بھی
گوناگوں مشکلات تھیں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ
ان خطوط پر تاریخ تحریر درج نہیں تھی کہیں کہیں درمیانِ
خط میں کوئی نامکمل تاریخ مل جاتی ہے جس کے ساتھ سنہ
درج نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے لیکن
دوسرے وسائل تک رسائی کے بغیر کوئی فیصلہ کن بات
کہنا مشکل ہے''۔

'علاوہ بریں ایک دو ہی خط ایسے ہیں جن پر مکتوب الیہ کا نام درج ہے۔ اب یہ ظاہری بات ہے کہ اس صورتِ حال میں داخلی شہادت ہی سے مدد لی جا سکتی ہے''۔ اس طریقۂ کار کے ساتھ ترمذی صاحب نے لکھا ہے کہ مجھے قابلِ لحاظ حد تک کامیابی ہوئی کہ میں ان خطوط کے مکتوب الیہ کا نام بھی بین السطور میں پڑھ سکا اور خط کے زمانۂ تحریر کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کر سکا۔

ترمذی صاحب نے اپنے ان نو دریافت خطوط پر ادبی زاویۂ نگاہ کے مقابلے

میں تاریخی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے زیادہ توجہ فرمائی ہے اور اس اعتبار سے ان کا مقدمہ "Introduction" اور یہ پیش لفظ جس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا فاضلِ مرتب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

تاریخی اور معاشرتی پس منظر نے غالب کے ذہن کو گہرے طور پر متاثر کیا اسی کا خوب صورت اظہار ان کے اسلوبِ نگارش سے بھی ہوتا ہے اس معنی میں غالب کے ذہن ان کی زندگی ان کے زمانے کو سمجھنے کے لیے یہ خطوط ایک ''کلیدی کردار'' ادا کرتے ہیں۔

موصوف نے اپنے طور پر اس کو سمجھنے کی بہترین کوشش کی کہ غالب کی زبانِ قلم پر جو کچھ آیا اور جس طرح آیا اس کا اس وقت کی زندگی سے کیا رشتہ ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے گورنمنٹ ریکارڈ سے ان دستاویزات کو بھی حاصل کیا جن سے آج اس مجموعہ خطوط کا ایک قاری یہ سمجھ سکتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے جب دوسری سند حاصل کی تو اس میں کس طرح کی تبدیلیاں عمل میں آئیں جو غالب اور ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ناانصافی تھی۔

غالب اسی کے خلاف چارہ جوئی کے لیے کلکتہ پہنچے تھے۔ اس لمبے سفر سے انہیں کچھ ذہنی فائدے ضرور پہنچے لیکن وہ زیر بار بھی بہت ہوئے۔ اور سود وزیاں کا یہ سلسلہ برابر آگے بڑھتا رہا۔

ان خطوط سے غالب کے اس مقدمے کی روداد سامنے آتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بعض خطوط سے واضح ہوتا ہے (جو پنج آہنگ میں شامل ہیں) اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ نے غالب کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ اس دستاویز کے

مطابق ہوا جو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے مئی ۱۸۰۶ء میں حاصل کی تھیں۔

غالب نے اس فیصلے کے خلاف Court of Directors کی نظر گاہ میں درخواست پیش کی اور اسے لندن بھیجا تھا۔ لیکن اس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا اور بات وہیں کی وہیں رہی صرف غالب پر ہی قرض داریوں کا بوجھ بڑھ گیا اور ان کی مشکلات میں صدگونہ اضافہ ہوا۔

یہاں سے مایوس ہو کر غالب نے کوئن وکٹوریہ سے بھی رحم و انصاف کی درخواست کی لیکن اسی زمانے میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء پیش آ گیا اور ملکہ کے دربار سے بھی غالب کو انصاف نہ مل سکا اس ہنگامے کے نتیجے میں ایک زمانے تک غالب کی پینشن بھی بند رہی اور بہ مشکل اس کی واگزاری ہوئی۔

ترمذی صاحب نے غالب کی پینشن کے مسئلے پر اپنی ایک دوسری کتاب Ghalib and the State میں بھی روشنی ڈالی ہے۔

Introduction میں ترمذی صاحب نے لکھا ہے کہ غالبؔ خطوط نگاری کے بے حد شوقین تھے عام طور پر وہ اپنے خطوں میں مکتوب الیہ کو اپنی ہی کہانی سناتے ہیں۔ جن لوگوں کو غالب نے خط لکھے ہیں ان کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں اور معاشرے میں ان افراد کی مختلف حیثیتوں سے تھا۔ ان کے درجات الگ الگ ہیں عمریں بھی اور صلاحیتیں بھی۔ ان مکتوبات سے جو ''نامہ ہائے فارسی'' اور پنج آہنگ میں شامل ہیں۔ غالب کی اپنی شخصیت اور شعور میں غیر معمولی ادبی اور شعری صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

ان خطوط کی مدد سے ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ غالب کی مختلف شعری تخلیقات کا ذہنی پس منظر اور اُن کی شان نزول کیا ہے جس سے غالب کے لب و لہجے

ان کے طریقۂ فکر اور اندازِ رسائی کی تفہیم میں مدد ملتی ہے اور اس کے ماسوا ان مکتوبات سے غالب کے معاشرتی ماحول اور اس زمانے کے سیاسی حالات پر بھی مختلف زاویوں سے روشنی پڑتی ہے۔

ہم ان خطوط کے منظر اور پس منظر سے یہ بھی جان سکتے ہیں کہ غالب کے زمانے میں سوسائٹی کس طرح بدل رہی ہے قدیم جاگیردارانہ نظام اپنی شکست و ریخت، کے کن مرحلوں سے گزر رہا ہے اور نئی معاشرتی روش کسی معنٰی میں اس کی جگہ لیتی جارہی ہے غالبؔ اس معاشرے کا حصہ بھی ہیں اس کے آوردہ و پروردہ بھی۔ اور اس کے زخم خوردہ بھی۔

بہرحال اِن مکتوبات سے غالب کے اپنے سوانح اور سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس روشنی میں ہم اس ''تغیرِ حال'' کو بھی دیکھ سکتے اور ایک حد تک پرکھ سکتے ہیں جو معاشرے میں نمود پزیر ہو رہی ہے۔

غالب کی زندگی میں ''پنج آہنگ'' دو بار شائع ہوئی جس میں غالب کے بہت سے فارسی مکتوبات شامل تھے لیکن غالب، ان دونوں اشاعتوں سے مطمئن نہیں تھے ایک میں خطوط کی تعداد کم تھی۔ اسے انہوں نے ''نامکمل'' تصور کیا۔ دوسری اشاعت میں غلطیاں اتنی تھیں کہ اس کا سامنے آنا بھی غیر اطمینان بخش ثابت ہوا۔ بایں ہمہ پنج آہنگ میں شامل خطوط سے غالب کے ابتدائی سوانح نامے کی ترتیب میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ نامہ ہائے فاسی میں جو مکتوبات شامل ہیں ان کا تعلق بھی اسی دورِ زندگی سے ہے جب غالب نے سفرِ کلکتہ اختیار کیا تھا۔ اور وہاں کچھ زمانے تک ان کا قیام رہا تھا۔

نامہ ہائے فارسی کے نادر قلمی نسخے کی دریافت اور اس کی ترتیب و تدوین سے متعلق فاضل مرتب کی کوششوں کو سراہتے ہوئے قاضی عبدالودود نے بزبان انگریزی اپنے پیش لفظ "Preface" میں لکھا ہے جس کی طرف اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

ترجمہ:

مسٹر علی اکبر ترمذی کی یہ دریافت غالب کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہماری معلومات میں ایک قابلِ قدر اضافہ کا سبب بنتی ہے فاضل مرتب نے ایک طویل تعارفی مقدمہ بھی لکھا ہے اور غالب کے بیانات کو محفوظ دستاویزی شہادتوں کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے ذہن کو بنانے میں کون کون سے تاریخی و تہذیبی اثرات کام کر رہے تھے ان کا بھی تجزیہ کیا ہے جو ایک لائق تحسین کاوش ہے اگر چہ غالب کے اسلوب کی تشکیل میں فورٹ ولیم کالج کے اثرات سے متعلق میرے اپنے کچھ شبہات ضرور ہیں۔ غالب کے ان خطوط کو تاریخی نقطۂ نظر سے انہوں نے مرتب کرنے کی جو سعی کی ہے اس کو بنظرِ استحسان دیکھا جانا چاہیے بعض مقامات اور ناموں سے متعلق وضاحتیں بھی اسی

ذیل میں آتی ہیں۔

> کتابت کی فروگذاشتیں اگر پروف ریڈنگ کے وقت
> دور ہو جاتیں تو اچھا تھا اگرچہ ان سے کتاب کی اپنی
> اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جن سے غالب کے مطالعہ کی
> بعض نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔''

نامہ ہائے فارسی غالب کے فارسی مکتوبات کا نو'' دریافت مجموعہ'' ہے جس کی بازیافت اور ترتیب اور حاشیوں کے لیے غالبیات سے دلچسپی رکھنے والی ادبی دنیا سید علی اکبر ترمذی صاحب کی مرہون منت ہے۔

ترمذی صاحب نے اسے غالب صدی کے موقع پر بزبان انگریزی اپنے فاصلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا اس کی اشاعت غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی کی طرف سے عمل میں آئی۔ اسے غالب صدی کی بہترین ادبی فتوحات میں شامل کیا جانا چاہیے اور اس کی ''بازیافت'' پر ترمذی صاحب آج بھی ہماری خصوصی تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ نسخہ عام کتابی تقطیع پر شایع ہوا ہے۔ دائیں جانب سے شروع ہونے والے سلسلہ نگارشات میں کتاب اس کے فاضل مرتب اور ناشر کا نام اس صورت میں درج ہے۔

نامہ ہائے فارسی غالب، سید اکبر علی ترمذی۔ غالب اکیڈمی دہلی نو ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی، کلکتہ دہلی نو، مدراس، بنگلور لندن نیویارک۔ بی ایس جیا سنگھی، ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی۔ غالب اکیڈمی دہلی نو ۱۳۔

تیسرے صفحہ کی بیاض پیشانی ''نامہ ہائے فارسی'' کی نگارش سے مزّین ہے چوتھا صفحہ خالی چھوڑا گیا ہے اس کے بعد کے صفحے پر صرف ''نامہ ہا'' درج ہے اس ورق کے عقب میں مخطوطہ سے اخذ کردہ جو عبارت آئی ہے وہ اپنے اوّل و آخر کے اجزائے نگارش سے محروم نظر آتی ہے۔

فہرست مضامین سے متعلق صفحہ پر ''دیباچہ انگلیسی'' اور مقدمہٗ انگلیسی سے وابستہ صفحات کی نشاندہی کی گئی ہے یہ ''نگارشِ آغاز'' چونکہ انگریزی زبان میں ہے بدیں وجہ اسے بائیں طرف سے شروع کیا گیا ہے اور یہ گزارش و نگارش کے ''ہفت رنگ'' دائرے تقریباً پچاس صفحات کو محیط ہیں اس میں غالب کے سوانحی کوائف کی تاریخی ترتیب بھی شامل ہے اور اغلاط کتابت کی تصحیح بھی۔

یہ ایک طرح کا سائنسی طریق رسائی ہے جس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مقدمہ سے متعلق صفحات میں قدیم کلکتہ کی دو ایسی شہری تصاویر بھی ہیں جو انیسویں صدی کے آغاز میں کلکتہ کی تعمیرات اور شہری تہذیب کی روش و کشش کی پرچھائیاں پیش کرتی ہیں۔

خود غالب نے کلکتہ کی شہریت کو ایک سے زیادہ موقعوں پر نذرانۂ تحسین پیش کیا ہے۔ نامہ ہائے فارسی کی پیش کش کے ساتھ مخطوطہ کے ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ مخطوطہ بہت ہی روا روی میں سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

مطبوعہ نسخہ کے بائیں جانب سے آغاز کی نشان دہی سرِ ورق پر کی گئی ہے جو بزبان انگریزی پریس اور اِدارۂ طباعت سے متعلق ہے۔

تعارف

مولوی سراج الدین علی خاں مولوی محمد علی خاں کے برادر بزرگ اور شہر کلکتہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ انہیں مولوی سراج الدین علی خاں کی بیگم کی خدمت میں غالب نے مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں اپنی باریابی کا ذکر کیا ہے مولوی ولایت حسن خاں انہیں بیگم زوجہ مولوی سراج الدین علی خاں (مرحوم) کے بھانجے تھے۔ جن کا تذکرہ کئی خطوط میں آیا ہے۔

غالب ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۳ ہجری میں لکھنؤ سے کلکتہ جاتے ہوئے باندا سے گزرے تھے تو مولوی محمد علی سے انکا تعارف ہوا تھا۔ یہ تعلق مولوی محمد علی کی حیات تک باقی رہا۔ مولوی صاحب کا انتقال ۱۲۴۷ھ مطابق ۳۲۔۱۸۳۱ء میں ہوا۔

نواب علی اکبر خاں طباطبائی غلام حسین خاں طباطبائی کے عزیز تھے یہ غلام حسین خاں مغلوں کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں اور ''سیر المتاخرین'' کے مصنف

ہیں۔ ہگلی کے امام باڑے سے متعلق وقف کے وہ متوّلی تھے ان کے نام کے ساتھ اس کا بھی ذکر آتا ہے۔

یہ تقرر سنہ ۱۸۱۲ء میں عمل میں آیا تھا بعد ازاں اس میں کچھ الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ بورڈ آف ریونیو Boar of Revenue اور ہگلی کے کلکٹر کی طرف سے یہ ذمہ داری کچھ دوسرے اشخاص کو سپرد کر دی گئی اس پر قانونی چارہ جوئی اور مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔

جب غالب کلکتہ میں تھے تو یہ کشمکش جاری تھی غالب نے اپنے ایک خط میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

مرزا غالب نواب صاحب کا بہت احترام کرتے تھے وہ بھی کلکتہ میں نو وارد اس ادیب کے تئیں شفقتِ بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔

غالب کے فارسی خطوط میں ان سے ملاقات کا ذکر بھی آتا ہے اور مرزا کے بعض فارسی مکتوبات خود ان کے نام بھی ہیں۔

غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں، ایک سپاہی پیشہ شخص تھے، انہوں نے لکھنؤ، جے پور، اَلور اور حیدر آباد میں قسمت آزمائی کی اپنے واقعۂ وفات کے زمانہ میں وہ ریاست اَلور کے متوسل تھے۔ غالب نے لکھا ہے کہ وہ ریاست کی طرف سے کسی مہم کی سربراہی کرتے ہوئے مقتول ہوئے۔

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

مرزا عبداللہ بیگ خاں نے اپنے ترکہ میں کوئی جاگیر یا جائداد نہیں چھوڑی غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے 'اپنے بھائی کے بچوں کی' پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ وہ

پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے نائب قلعہ دار تھے، بعد میں انہوں نے انگریزی افواج کے ساتھ خود کو وابستہ کیا اور جاگیر و تنخواہ سے سرفراز کیے گئے۔

سنہ ۱۸۰٦ء عیسوی میں ہاتھی سے گر کر اُن کا انتقال ہو گیا تو لارڈ لیک بہادر نے جاگیر و تنخواہ کے بدلے ان کے وارثان کی پینشن مقرر کر دی۔ ترمذی صاحب نے اس کے لیے لکھا ہے:

> Lord Lake's letter of 19 Rabi I 1221/7 June 1806 stipulating that only Rs. 5000/- per annum were due from the jagir of Ahmad Baksh to the dependants of Nasr Allah Beg Khan and specifying that Rs. 2000/- per annum were due to Khwaja Hajji while that the remeining Rs. 3000/- were to be shared equally by the mother and sister of Nasr Allah Beg Khan on one side and Mirza Nausha and Mirza Yusuf, the nephews of the late Nasr Allah Beg Khan, on the other.

یہ دوسری دستاویز تھی، پہلی دستاویز میں تقسیم اس طرح نہ تھی بہر نوع مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سانحہ کے وقت مرزا غالب کی عمر نو سال اور ان کے بھائی مرزا یوسف کی عمر ۷ سال تھی۔ اس وقت پینشن سے متعلق ''دستاویز'' تیار ہوئی اس کی رو سے جو سالانہ رقم طے ہوئی تھی وہ بعد کی دستاویز میں کم ہو گئی اس کی ذمہ داری نواب احمد بخش خاں کی 'حکمت عملی' پر تھی۔ اس کی طرف غالب کے سفرِ دیار مشرق کے ذیل میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔

غالب کا خیال تھا کہ اس خاص معاملہ میں ''ناانصافیوں کی تلافی ممکن ہے'' بشر طیکہ ''نظمائے کونسل'' اور گورنر جنرل کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا جائے۔ اسی غرض

سے انہوں نے کلکتہ جیسے دور و دراز شہر کا سفر اختیار کیا، انگریز افسران سے ملنے پر انہیں مزید یہ توقع ہوئی کہ صحیح صورت حال کے سامنے آجانے پر ان کو وہ پینشن ملے گی جو ابتداءً سرکار انگریز کمپنی بہادر کی طرف سے وارثان نصر اللہ بیگ خاں کے لیے طے ہوئی تھی۔

کچھ زمانے تک 'غالب' کلکتہ میں 'خوش آئند توقعات کے ساتھ' ٹھیرے رہے مسٹر اسٹرلنگ اور بعض دوسرے انگریز افسران سے شگفتہ تعلقات اور خوش گوار روابط کی وجہ سے غالب کی توقعات کچھ ایسی خلافِ قیاس بھی نہیں تھیں لیکن مقدمہ کی پیش کش اور کارروائی میں بعض نئی پیچیدگیاں اس وقت سامنے آئیں جب انہیں معلوم ہوا کہ ازروے قانون اس مقدمہ کو پہلے ریزیڈینٹ دہلی کی سرکار میں پیش ہونا چاہیے بعدازاں کلکتہ میں اس کی شنوائی ہوسکتی ہے۔

غالب فوری طور پر دہلی نہیں جاسکتے تھے اور کلکتہ میں قیام بھی مشکل تھا انہوں نے مولوی محمد علی خاں سے ایک ہزار روپیہ بطور قرض طلب کیا۔ اخراجات کم کرنے کے لیے بعض ایسے ملازموں کو الگ کیا جو اِن حالات میں کچھ زیادہ ضروری بھی نہ تھے۔

دہلی میں مولوی فضل حق کو خط لکھا کہ وہ دادگاہِ دہلی کے لیے کسی مناسب اور جان کار شخص کو بطور وکیل مقرر کرنے میں، ان کی مدد کریں۔ کچھ وقت تک مولانا کی طرف سے خط کے آنے اور وکیل کے مقرر کیے جانے کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔

جیسے ہی مولوی فضل حق خیرآبادی کا خط اور منشی ہیرالال کے وکیل مقرر ہو

جانے کا حال ان کو معلوم ہوا انہوں نے اپنے مقدمہ کے ضروری کاغذات تیار کر کے بذریعہ ''درجِ رجسٹر ڈاک'' دہلی ریزیڈینسی روانہ کر دیے۔ اسی کے ساتھ منشی الطاف حسین کو سفارشی خط لکھوایا جو دہلی ریزیڈینسی میں مسٹر کال بروک ریزیڈینٹ دہلی کے میر منشی تھے۔

.....مسٹر کال بروک کے سیکریٹری کے نام مسٹر اسٹرلنگ سے سفارشی خط حاصل کیا، ایک شاعر مزاج شخص کے لیے یہ بڑے امتحان کا مرحلہ تھا۔ کاغذات کی روانگی کی تاریخ ۱۲۴۴ھ/ ۲۶/اگست ۱۸۲۸ء تھی۔

ان کاغذات کے دہلی روانہ کرنے کے بعد غالب کے پاس صرف ۱۰۰ روپے رہ گئے تھے وہ بہت متفکر تھے کہ اسی اثناء میں مولوی ولایت حسن خاں کی معرفت مولوی محمد علی صدر امین باندا کی طرف سے دو سو روپے کی ہنڈوی ملی جس سے متعلق تاثر ۹/اکتوبر ۱۸۲۸ء سے متعلقہ خط میں موجود ہے۔

اس ہنڈوی کے ملنے سے غالب کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ مگر اپنے وکیل منشی ہیرالال کو مقدمے سے متعلق ضروری کاغذات بھیجنے کے بعد دہلی سے انہیں کوئی اطلاع نہیں ملی کہ وہ کاغذات پہنچے یا نہیں۔ غالب نے مختلف لوگوں کو خط لکھے لیکن کسی کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی وجہ سے زیادہ پریشان تھے وہ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریزی ڈاک، خطوط کے بھیجے جانے کے لیے زیادہ معتبر وسیلہ ہے اور اس میں خط گم نہیں ہوتے۔ پھر یہ کیا ہوا!

بہر حال یہ خط ہفتہ ۲ رشعبان ۱۲۴۴ھ/ ۷/فروری ۱۸۲۹ء کو پہنچ گیا اور تین روز کے بعد یہ اپیل ریزیڈینٹ کی عدالت میں دائر ہوگئی۔

مسٹر کال بروک نے جب ان کاغذات کو دیکھا تو یہ کہا کہ بعض ضروری کاغذات اس میں شامل نہیں چونکہ لارڈ لیک بہادر نے اس سلسلے کی مختلف سندات جاری کی تھیں۔ اس لیے ان کو دیکھنا ضروری ہے۔ وہ دستاویزات کلکتے سے طلب کی جائیں اور ان کاغذات کے ساتھ شامل ہوں تبھی صورتِ حال پر صحیح طور سے غور کیا جاسکتا ہے۔

غالب اس صورتِ حال سے مطمئین نہیں تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے پہنچنے میں تاخیر سے، انکے کیس کے فیصلے میں اور زیادہ دیر ہوجائے گی، ایک اور خط میں وہ اس بات پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں کہ خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں شامل کرنا، سرتاسر غلط بات ہے وہ اُن کے صحیح طور پر کوئی رشتے دار یا نصر اللہ بیگ خاں کے وارث ہو ہی نہیں سکتے۔

ایک خط میں (ہمیں اس بارۂ خاص میں غالب کی تحریر ملتی ہے کہ وہ ۲۵/۱۸۲۸ء مطابق ۱۷/جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ کو ولیم فریزر سے ملنے جاتے ہیں تو انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولیم بیلی تو شکار پر گئے ہوئے ہیں اور لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل دورے پر ہیں۔

(ایک اور خط سے یہ معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ ولیم بیلی اور لارڈ ولیم بینٹنگ کلکتے واپس لوٹ آئے ہیں۔)

اس وقت مہاراجہ بنارس واردِ کلکتہ ہیں بظاہر تو وہ تیرتھ یاترا کے لیے جگن ناتھ پوری اڑیسہ جارہے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ کلکتے اس حکم نامے کے خلاف چارہ جوئی کی غرض سے آئے ہیں جس کے تحت ان کے اختیارات کم ہوگئے ہیں اسی

خط میں اس کا بھی ذکر ہے کہ بروز پیر ۱۱/شعبان ۱۲۴۴ھ/۱۶/فروری ۱۸۲۹ء کو دربار ہوا جس میں غالب نے بھی شرکت کی۔ شرکت کرنے والوں میں مہاراجہ بنارس بھی تھے۔ غالب کو خلعت نہیں ملا، نواب علی اکبر خاں طباطبائی کی نشست خالی رہی انہوں نے شرکت نہیں فرمائی۔ جن لوگوں نے شرکت کی تھی ان کے نام اس طرح دیے گئے ہیں۔

راجہ بھوپ سنگھ (عظیم آباد)

مانک سنگھ

مرزا افضل بیگ (وکیلِ بادشاہِ دہلی)

منشی عاشق علی خاں بہادر (وکیل اودھ)

رائے جتن رائے (وکیل جودھپور)

رائے گردھاری لال (وکیل مرشد آباد)

اوما کانت اپادھیائے (وکیل نیپال)

رائے رتن سنگھ (وکیل جے پور)

نواب علی اکبر خاں نے (شرکت نہیں فرمائی)

اسد اللہ خاں (نصر اللہ بیگ خاں کے بھتیجے)

غالب اس بات پر خوش تھے کہ ان کو دربار میں طلب کیا گیا اور ایسے بڑے لوگوں کے ساتھ وہ بھی دربار میں شریک ہونے کے مستحق قرار پائے۔ ان کو یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جیسے ہی بارش کا زمانہ ختم ہو جائے گا، لارڈ ولیم بینٹنک شمالی ہندوستان کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے۔ اس صورتِ حال نے غالب کے تمام منصوبوں کو

درہم برہم کر دیا۔ جن کے مطابق وہ یہ خیال کرتے تھے کہ دہلی سے رپورٹ آنے پر وہ کلکتے میں رہتے ہوئے سرکار کمپنی بہادر کے اعلیٰ افسران سے اپنے مقدمے کا کوئی ایسا فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ان کے حق میں ہوگا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا، مقدمہ ریزیڈینسی کو بازگشت ہوا۔

غالب کے لیے یہ بوجوہ آسان نہیں تھا کہ وہ کلکتہ چھوڑ دیں اور جلد سے جلد دہلی پہنچ جائیں اس کے لیے وسائل سفر درکار تھے جن سے غالب اس وقت محروم تھے۔ ان حالات میں غالب نے ۱۰۰۰/روپئے کے قرض کے لیے نواب ذوالفقار علی رئیس باندا سے درخواست کی۔

اپنے مکتوب مورخہ ۱۷/اپریل ۱۸۲۹ء میں غالب نے یہ اطلاع دی ہے کہ ان کی عرض داشت معہ ضروری کاغذات، ریزیڈینسی پہنچ گئی۔ اسی کے ساتھ انہیں یہ اطلاع بھی دی گئی کہ یہ تمام کاغذات کلکتہ بھیجے جا رہے ہیں تاکہ نظمائے کونسل کے ملاحظہ میں آجائیں۔

مسٹر فریزر نے بھی ان کو یہ اطلاع دی کہ دہلی کے صاحب ریزیڈینٹ کال بروک نے اپنی رپورٹ کے ساتھ ان کاغذات کو کلکتہ روانہ کر دیا ہے۔ ۳۰/شوال ۱۲۴۴/۴مئی ۱۸۲۹ء کو غالب منشی الطاف حسین کو خط لکھتے ہیں۔ (یہ منشی الطاف حسین ریزیڈینٹ دہلی کے میر منشی تھے۔)

اواخرِ ماہِ ذیقعدہ یا اوائلِ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ ابتدائے جون ۱۸۲۸ء میں غالب نے ۵۷۵ روپے کی ہنڈوی وصول کی جو اکبر آباد آگرہ سے آئی تھی نیز منشی عاشق علی خاں کلکتہ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ سفر انہوں نے دریائی راستے سے کیا ان

کے بعد حکیم ظفر علی خاں بھی فیض آباد چلے گئے جو بادشاہِ اودھ کے وکیل تھے بعد ازاں مولوی عبدالکریم روانہ ہوئے جو آٹھ ماہ سے کلکتہ میں قیام فرما تھے۔ (ایک خط کی روسے) یہی زمانہ تھا جب غالب نے فریزر کے پاس جا کر یہ معلوم کیا کہ دہلی سے کوئی جواب آیا ہے یا نہیں (جو اس وقت تک نہیں آیا تھا۔)

غالب نے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا سے یہ خواہش کی کہ وہ منشی محسن علی کو جو دہلی میں ہیں اپنی طرف سے خط لکھیں اور اُن سے خواہش کریں کہ وہ اس امر کی اطلاع دیں کہ وہاں کیا کارروائی ہوئی۔ اسی خط میں غالب نے مولوی سراج الدین علی خاں کی فرمایش سے جو تاریخِ وفات لکھی تھی، وہ بھی مولوی محمد علی خاں کو بھیجی۔

اسی زمانے میں غالب نے کلکتہ میں ایک اور دربار میں بھی شرکت کی جو اگست کی پہلی تاریخ کو ۱۸۲۸ء کو منعقد کیا گیا تھا۔ اس دربار میں اُن کو ۱۰ رویں نمبر کی نشست دی گئی تھی جو نواب علی اکبر خاں کے برابر میں تھی، یہ گویا اس سال کا آخری دربار تھا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ اب گورنر جنرل کا دفتر شمالی ہندوستان کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ دفتر کے عملہ کی روانگی ستمبر میں ہوگی.....اور خود گورنر جنرل اکتوبر میں روانہ ہوں گے۔

اس اعلان سے غالب کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ دہلی سے جس رپورٹ کی آمد کا وہ انتظار کر رہے ہیں وہ اب گورنر جنرل کی روانگی سے پہلے کلکتہ نہیں پہنچے گی۔

غالب نے اپنا ذہن بنالیا کہ وہ کلکتہ چھوڑ دیں گے اور سرِ راہ کہیں گورنر جنرل سے ملاقات کریں گے۔ جمعہ کے دِن ۱۳ رصفر ۱۲۴۵ھ، ۱۴ راگست ۱۸۲۹ء غالب نے

اپنا سامان بذریعہ کشتی روانہ کردیا۔ اور جمعرات یا جمعہ کو ۱۹،۲۰ صفر ۱۲۴۵ھ ۲۰، ۲۱ اگست ۱۸۲۹ء وہ خود روانہ ہوئے۔ (جمعہ جمادی الاول ۱۲۴۵ھ ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء کو باندہ پہنچے)

باندا میں وہ نواب ذوالفقار علی خاں رئیس باندا اور مولوی محمد علی خاں سے ملے اسی کے ساتھ اُن کو یہ معلوم ہوا کہ مسٹر کال بروک معزول ہو گئے اور مسٹر فرانسیس ہاکنس کو ان کی جگہ دہلی کا ریزیڈینٹ مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے نواب علی اکبر خاں کو خط لکھا کہ وہ اپنی طرف سے ایک سفارشی خط فرانسیس ہاکنس کو لکھیں اور دہلی بھیج دیں۔ یہ خط ششم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۴ نومبر ۱۸۲۹ء کو لکھا گیا۔

تین روز کے بعد ۹ جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۷ نومبر ۱۸۲۹ء کو غالب نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ باندا سے دہلی کے لیے روانہ ہو جائیں۔ غالب یکشنبہ یعنی اتوار کے دن ۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچے۔ یہ ماہ جمادی الثانی کی پہلی تاریخ تھی اور نومبر ۱۸۲۹ء کی ۲۹ ویں تاریخ۔ یہاں پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی حالت اب بہت خراب ہے۔ اس کے مقابلے میں جب وہ دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو یہ صورت نہ تھی۔ انہوں نے مسٹر ہاکنس کے لیے ایک قصیدہ لکھا اور دہلی کے اس نئے ریزیڈنٹ سے ملاقات کے لیے اس کی رہائش گاہ پر گئے۔

.....

غالب کلکتہ کے حسن شہریت، وہاں کی خوبی انتظام، تمدنی پیش رفت اور اسی کے ساتھ بعض انگریز افسران کے دوستانہ و مخلصانہ رویے کو دیکھ کر انگریزوں کی حکومت کو بھی پسند کرنے لگے تھے۔

انگلستان میں جو صنعتی انقلاب رونما ہوا تھا اور اس کی وجہ سے ذہنوں اور زندگیوں میں جو تبدیلی آئی تھی اس کا اثر انگریزی انتظام کے تحت کلکتہ کی شہری تہذیب میں بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ غالب نے اسی کی طرف شارہ کیے ہیں۔

ترمذی صاحب نے کلکتہ سے متعلق غالب کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" In Calcutta Ghalib stayed for about 18 months and began to love the city for different reasons. The Climate of Calcutta suited his constitution and most of his chronic ailments disappeard.

In summer he took fresh coconutwater with candy but gave it up during monsoon. In fact he found the climate of calcutta more congeniat than that of Delhi for his health.

اگرچہ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں غالب بہت سی پریشانیوں اور اپنے حالات کے زیرِ اثر نا آسودگیوں کا شکار رہے، خاص طور پر مقدمہ کی دہلی کی طرف بازگشت کے سلسلہ میں وہ دہلی ریزیڈینسی سے اپنے حق میں انصاف کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

بہر نوع شہر کلکتہ ان کو بہت پسند تھا۔ انہیں مولوی محمد علی اور نواب علی اکبر طباطبائی جیسے کچھ بڑے لوگوں کی صحبت میسر آئی۔ بعض انگریز افسران سے ان کے دوستانہ روابط تھے اور ان کی محفل میں عطر و پان سے ان کی تواضع ہوتی تھی۔

اس کے ماسوا کلکتہ پہنچ کر غالب کی صحت بہتر ہوگئی تھی اور وہ بہت دنوں سے جن بیماریوں میں مبتلا تھے ان سے نجات مل گئی تھی۔ اس کی طرف بھی بطورِ خاص ترمذی صاحب نے توجہ دلائی ہے اور کلکتے کی زندگی میں جو سائنسی اندازِ نظر آ رہا تھا، گنگا

، برہم پتر، اور ہگلی کو ملا کر سائنسداں انجینئروں نے اسٹیمروں کی آمد ورفت کے لیے جو آبِ راہ پیدا کی تھی غالب اس سے بہت متاثر رہے۔ وہ غیر معمولی طور پر ذہین انسان تھے اور اپنے زمانے کی انقلاب آفریں تاریخ پر بھی ان کی نظر تھی اس کا اندازہ سفر قیام کے واقعات اور ان پر تبصروں سے ہوتا ہے اور بعض مسائل پر اُن کی نظر داری سے بھی

> "Being the de facto capital of British India, Calcutta had all the glamour of English metropolis. Ghalib was naturally fascinated by the graceful attires. He was so much swayed by the dazzling spectre of the place that he repented his ret to Delhi as to be from the Jannat al Bilad "

مولوی محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نے اسٹیمر کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ دریائی سفر کا وہ ایک زیادہ بہتر وسیلہ ہے ایک تیز رفتار سواری ہے اور دو ہفتہ کے اندر اندر کلکتہ سے الہ آباد تک کا سفر طے کر لیتا ہے یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسٹیمر اپنی رفتار ہی کے اعتبار سے بہتر سواری نہیں تھی اس میں رہائش کی جگہ بھی کچھ زیادہ بہتر ہوتی تھی غالب نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

جب کہ دریا کے ''اتار چڑھاؤ'' سے کشتی کا سفر موسم بہ موسم متاثر ہوتا رہتا ہے، غالب ڈاک کی آمد ورفت میں انگریزی انتظام پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے اس اعتماد کا انہوں نے اپنے ایک خط میں اظہار بھی کیا ہے۔ غالب نے اپنا مختار نامہ انگریزی ڈاک کے ذریعے بھیجا تھا۔ اس زمانے میں ڈاک کے اخراجات، روانہ کی جانے والی اشیاء کے اعتبار سے ہوتے تھے اور ہر ایک آرٹیکل پر ایک روپیہ لیا جاتا تھا۔

پریس کی ایجاد اور رواج نے بھی وہ حالات پیدا کیے کہ ہندوستان ''نشاۃ

الثانیہ'' کے دور میں داخل ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نئے انداز کے تعلیمی ادارے قائم ہوتے جا رہے ہیں، کم سے کم بڑے بڑے شہروں میں ان کے وجود موجود کو دیکھا جا سکتا ہے۔

وارن ہیسٹنگس نے ۱۷۸۱ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا اس کے قیام کا مقصد سائنس کی مختلف شاخوں کی تعلیم تھا جسے آج دو سو برس سے بھی زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ جس کا مقصد انگریز کمپنی بہادر کے ملازموں کو ہندوستانی زبانیں سکھلانا تھا، یہ ذمہ داری مسٹر جان گلکرسٹ کو سپرد کی گئی تھی کہ وہ جلد از جلد اس کالج میں پڑھائے جانے کے لیے نصابی کتابیں Text Books تیار کرائیں ان کتابوں کی تیاری میں انہوں نے بہ حیثیت نگراں بھی حصہ لیا اور بعض کتابیں اور رسالے خود بھی لکھے۔

اُس وقت تک اُردو میں ایسی کتابیں موجود نہیں تھیں جن کی مدد سے کمپنی کے ملازموں کو ہندوی زبانیں پڑھائی جا سکتیں اب ایک ہی متبادل صورت باقی رہ گئی تھی اور وہ ترجمہ نگاری تھی اور زیادہ تر یہی کام فورٹ ولیم کالج میں ہوا بھی۔

نصابی کتابوں کے لیے عربی، فارسی اور سنسکرت کتابوں کے علاوہ انگریزی کتابیں بھی انتخاب میں آسکتی تھیں لیکن فورٹ ولیم کالج میں جن مصنفین کو چنا گیا وہ عربی فارسی اور سنسکرت والے تھے، اُردو ان کی مادری زبان تھی لیکن انگریزی انہیں نہیں آتی تھی اسی لیے انگریزی سے کتابوں کا انتخاب بھی عمل میں نہیں آیا۔

شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی کمپنی کے ملازموں کو انگریزی تو بہرحال آتی تھی اور وہ انگریزی لٹریچر کی روایت سے بھی ناواقف نہ ہوں گے۔ اس لیے زیادہ

تر فارسی کتابوں کا انتخاب کیا گیا تا کہ کمپنی کے مغربی ملازمین، جو بطور طالب علم اس کالج سے وابستہ ہوتے تھے یہاں کے خیالات، تاریخی واقعات، تہذیبی رویّوں اور قصّے کہانیوں سے واقف ہو جائیں۔ بعض سنسکرت کتابوں کو بھی لیا گیا اور انگریزی اثرات کی نمائندگی بھی اس طرح ہوئی کہ لغت اور قواعد کو نئے اصولوں کے مطابق ترتیب دیا گیا۔ نثر نگاری میں نیا اسلوب آیا Punctuation (علاماتِ قراۃ) کو بھی رائج کیا گیا تا کہ لفظ کو صحیح طور پر پڑھا جا سکے۔

مشرقی داستان نگار "Orientalist" کے عنوان سے بنگلہ سنسکرت اور فارسی کی کچھ کہانیاں گلکرسٹ نے رومن اسکرپٹ میں بھی شائع کیں۔ ان کی زبان ہندوستانی رکھی اور ان کا رسم الخط انگریزی (رومن)۔

کلکتہ میں رہتے ہوئے غالب مسٹر اینڈ ریو اسٹرلنگ سے بھی متعارف ہوئے جو گورنر جنرل کی کونسل کے اہم اراکین میں سے تھے۔ یہاں کے قیام کے زمانے میں غالب کا تعارف منشی عبدالکریم سے بھی ہوا جو کمپنی کے ''پرشین سیکٹریٹ'' میں میر منشی تھے۔ اسی کے ساتھ وہ مولوی کرم حسین خاں سے بھی واقف ہوئے۔ یہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے میر منشی تھے۔

ان کے زیرِ اثر غالب نے اپنی مرصع نگاری کو بڑی حد تک ترک کیا اور سادہ نگاری کی طرف آ گئے۔ اگر چہ ان کے خطوں میں گاہ گاہ مشکل، پیچیدہ یا صناعانہ زبان بھی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن زیادہ تر وہ سادہ ادبی زبان ہی میں لکھتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی کوششیں کہ وہ صنعتِ تعطیل میں لکھیں یا ایسی فارسی میں..... جو نیامیختہ بعربی ''ہو، یہ خاص طرح کی ادبی نگارشات ہیں جنہیں ان کی روش عام میں شامل نہیں کیا

جانا چاہیے۔

ان کی نثری اور شعری نگارشات میں بعض نئی باتیں سامنے آئیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قیام کلکتہ کے اثرات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، وقت بدل رہا تھا، زمانے میں بدلاؤ آرہا تھا ایسی صورت میں غالب جیسا ذہین آدمی نئے اثرات کو قبول کرنے اور پرانے انداز نظر کو باقی رکھنے پر مسلسل آمادہ رہے، یہ ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اپنی فارسی میں بھی انگریزی الفاظ یہ کہیے کہ بلا تکلف استعمال کیے ہیں۔ ان میں گورنر جنرل لارڈ، مسٹر، سیکریٹری، رپورٹ، ریزیڈنٹ اور کونسل جیسے الفاظ شامل ہیں۔

اس زمرہ میں ایسے الفاظ کو بھی رکھیے جہاں غالب نے انگریزی اور اس کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ کی ترکیبیں استعمال کی ہیں جیسے عملۂ کونسل جو اسٹاف کونسل کی جگہ استعمال ہوا ہے اور اعیانِ کونسل جو ممبر آف کونسل کی جگہ آیا ہے اور قرطاس، اسٹیمپ جو اسٹیمپ پیپر کے لئے دفتر ریزیڈینسی یہ ریزیڈنٹ آفس کے لیے، رپورٹ ثانوی یا مراعات گورنری Second Report Governor کے لیے رپورٹ مقدمہ یا Case Report اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ۔

کبھی کبھی وہ ایسے لفظ فارسی اضافت کے ساتھ بھی لاتے تھے جیسے سکترِ کونسل یا Secretary Counsil سکتر ریزیڈینسی Secretary Residency

دل چسپ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے 'لفظوں' کو اس طرح ترکیب دے، کر جو مرکب لفظ بنائے انہیں اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کیا ہے۔ جسے رپورٹ کردن Reporting کے بدلے میں۔ وغیرہ

سفرِ کلکتہ مرزا غالب کی زندگی میں ایک نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ غالب اپنے اس خاص مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے جس کے ساتھ انہوں نے یہ سفر اختیار کیا تھا لیکن اس کا جو اثر ان کی زندگی پر مرتب ہوا وہ غیر معمولی طور پر اہم اور نتیجہ خیز تھا۔ کلکتہ کی زندگی میں اُبھرتے ہوئے نئے تہذیبی افکار شہر کا انتظام اور شہری زندگی میں رونما ہوتی ہوئی تبدیلیاں اس لیے بھی اہم تھیں کہ مغلوں کے دورِ زوال میں اب انہیں سے نئی روشنی اور نئی رہنمائی حاصل کی جا سکتی تھی۔

.....

ان خطوط کی تاریخی ترتیب اور ان کی تحریر و پیشکش کے مسائل اور مراحل سے گزر کر جب ہم ان کی ادبی و تہذیبی اہمیت کی طرف آتے ہیں تو یہ سوچ کر اور دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پنج آہنگ میں شامل خطوط ہوں یا پھر نامہ ''ہائے فارسی'' کے اوراق کی زینت بننے والے نگارش نامے یا آثرِ غالب اور متفرقات میں سامنے آنے والی مکتوباتی تحریریں سب میں باعتبار موضوع پھر کوئی خاص نیاپن نہیں، لیکن طرزِ ادا اور اسلوب گفتگو نے ان فارسی خطوط کو مغلوں کے آخری دور کی بہترین ادبی فتوحات کا ناقابل فراموش حصہ بنا دیا ہے۔

غالب اپنی بات کہتے ہیں تو دستور انشا پردازی کے تحت بات میں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کرنے کی سعی نہیں کرتے ان کی عبارت و اشارت میں حسن ادا کا پہلو خود بخود اُبھرتا ہے جو غالب کی تخلیقی حسیّت کی کارفرمائی ہے۔

غالب نئے الفاظ کی تلاش میں رہتے ہیں مگر اُن کے یہاں تلاش کے معنی ایسی تراش خراش کے نہیں ہیں جہاں حسنِ معنی اور مشاطگی کی ادانمائی میں فرق باقی نہیں رہتا۔ یہاں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی''۔

ان کے بیشتر خطوط میں اور خطوں کے بیشتر عبارت پاروں میں شخصی اظہار اور انفرادی اسلوب کے بہترین نمونے سامنے آتے ہیں یہ سب ایک خاص تہذیبی انداز نظر اور اُس ادبی منظر نامے کا پرتو معلوم ہوتا ہے جس کے زیرِ اثر غالب کے ذہنی تربیت ہوئی سب سے زیادہ فائدہ تو ان کے ذہنِ رسا اور طبع اختراع پسند نے مبداء فیاض ہی سے اُٹھایا۔

وہ ابوالفضل علامی جیسے بڑے فاضل ادیب اور اختراع پسند نثر نگار سے متاثر ہوئے مگر اس تاریخی شخصیت کے ذہن کی تابناکیاں یا تابکاریاں دور تک اور دیر تک ان کی زبان اور ذہن کے ساتھ رہی ہوں شاید ایسا بھی نہیں۔

ان کے مکتوبات کی نثری روش اور ادبی کشش کو ان کی اپنی روشنی اور رہنمائی ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ان میں اپنی پریشانیوں کا ذکر چھیڑتے ہیں اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کی کہانی سناتے ہیں اور گاہ گاہ وہ حالت بھی ہوتی ہے ''اور اندیشہ ہائے دور و دراز۔''

ان کا ذہن ان شب و روز میں جب یہ خطوط بزبان فارسی لکھے گئے ہیں جز وقتِ معاملات اور غیر وقتی مسائل میں الجھا رہتا ہے مگر وہ خط لکھنے بیٹھتے ہیں تو خوشی کی بات ہو یا رنج کی کوئی اطمینان بخش صورت ہو یا کرب و اضطراب کا عالم ان کی انگلیوں کی جنبش کے ساتھ قلم حرکت میں آتا ہے تو قوس قزح جیسے حلقے اور ہفت رنگ دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔

ان کے یہاں سادگی اور پرکاری میں آب و آتش کا سا فرق نہیں یہ دونوں تارحریر دو رنگ کی طرح، ایک دوسرے سے، ہم آہنگ ہیں چاہے ہم رنگ نہ ہوں۔

آرٹ بہرحال آرٹ ہے صناعی جب تخلیقی حدود سے مل جاتی ہے تو ''ہنرمندی ''فن'' بن جاتی ہے اور اس کی سرحدیں ریشم کی سرحدوں جیسا انداز اختیار کرلیتی ہیں جن کو چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلے خط سے لے کر آخری مکتوب تک، اپنی تحریری خوبیوں کے اعتبار سے یہ سب ان نگارشات میں سے ہیں جہاں شخصی اظہار، تہذیبی انداز نظر کا خوب صورت عکس پیش کرتا ہے۔ تحریر میں تخلیقی حسیّت کا یہ دل آویز مظر نامہ صرف تکلف یا تصنع کے دائرے میں نہیں آتا۔ اس کے اپنے ایک منعی ہیں جن کے ثقافتی رشتے ادب کی تاریخی معنویت سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قدیم ادب میں آرائشی لوازمات اور آراستگی کے عناصر کو ہمیں اس دور زندگی، اُس کے ذہنی قدر و معیار نیز لسانی رویّوں کو صرف شعر و سخن کے ''تناظر ہی میں دیکھنا کافی نہیں اس عہد کی ادبی نثر بھی شعری حِسیّت کی آئنہ دار ہے اور فن شعر کا مرئی اور غیر مرئی رشتہ اس عہد کے فنون لطیفہ سے بھی ہے۔ غالب کا یہ شعر شاید اسی سچائی کی طرف اشارہ کررہا ہے:

وہی اک بات یاں موجِ نفس واں نگہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان مکتوباتی نثر پاروں کی تحریر و نگارش کے وقت غالب کا ذہن رسا گونا گوں مشکلات اور مستقبل کے اندیشوں میں گھرا ہوا ہے تا اینکہ ان کے حلقۂ فکر و نظر کو افسردگی کی آرزو سے الگ کر کے دیکھنا بھی آساں نہیں مگر ان کے تخلیقی سرجوش کا اظہار اس طرز و روش کے ساتھ ہوا ہے کہ بے اختیار یہ کہنے

کو جی چاہتا ہے:

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

یہ زمانہ ان کی زندگی میں جاہ مندیوں کا دور نہیں بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے بایں ہمہ فارسی شاعری بالخصوص فارسی نثر میں ان کی ادبی فتوحات کے لحاظ سے یہ عہد بہت غیر معمولی ہے۔ جس پر فارسی زبان کو فخر کرنا چاہیے۔

ہم غالب کی زندگی اور ذہنی صورت حال کو اگر نظر میں رکھیں اور ان کے تئیں جان و جہاں کی کش مکش بھی ہماری نگاہ میں رہے تو ذہن یہ سوچنے پر مائل ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک طرح پر ''امرت منتھن'' کا عمل تھا۔ جس کے دوران غالب کا یہ ادبی کارنامہ ایک 'لمحۂ تخلیق' کی طرح اُبھرتا نظر آتا ہے جس میں شفق کے پھولوں جیسی رنگارنگی اور آبی دائروں جیسی وسعت طلبی ہے۔

خط ایک بہت ہی عمومی اور غیر مختص صنف نگارش ہے اس میں کسی انفرادی لب وہ لہجہ کا ابھرنا بھی ایک اتفاقی صورت ہوتی ہے اس کا بے لاگ یا بے تکلف طرز اظہار سے آراستہ ہونا بھی ایک اضافی شکل ہے کہنے والا تو اپنے انداز میں اپنے وہم و خیال کی بات کہتا ہے اُسے یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کو بھی اپنی بات کی معنی فہمی اور اپنے مقصد تک رسائی میں شریک کرنا ہے ورنہ خط بے بات کی بات ہو جائے گا۔ مخاطب کی نفسیاتی شراکت اور بیشتر صورتوں میں ہم آہنگی کے بغیر تحریر خط نارسائیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

اب یہ طرز تخاطب اور اندازِ ادا کا اثر و تاثر ہے جو بزبانِ قلم بات چیت کو نہ

صرف لائق پزیرائی بناتا ہے۔ بلکہ دل آویز عبارت میں پیچیدگی خط کو اگر اس مقصدِ تحریر سے دور کردیتی ہے تو سپاٹ پن کی حد تک آگے بڑھی ہوئی سادگی اُسے بے لطف و بے کیف بنا دیتی ہے۔ عام باتوں کی طرح عام خط بھی برائے مقصد ہوتے ہیں برائے ادب نہیں۔

اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ بیشتر استادانہ تحریریں ''تراش خراش'' کی آئنہ دار ہوتی ہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ان تحریروں کو تخیل یا تمثیل کی مدد سے خوش روش و پرکشش بنانے کی سعی کی جاتی ہے لیکن ادبی نثر اور اس میں بھی تخلیقی حسیّت سے آراستہ نثر اپنے معنی اور معنویت کے لحاظ سے کچھ اور ہی ہوتی ہے جسے ورائے شاعری کہا جانا چاہیے۔

یہ چند فقرے ملاحظہ ہوں:

پیش ازیں کہ بحکم ہوائے دل، فریفتۂ کارخانۂ رنگ و بو بودم و بے پروا خرام، بافراخی ہائے آرزو۔ سیہ مستانہ رحیقِ شعلہ بہ پیمانہ می ریختم۔

اکنوں آں شررکاری ہائے شوق کجا کہ نفس را از شعلۂ دروں محروم نہ دارد وآں جوشِ بہار اندیشہ کو کہ۔ لالہ وگل از نقاب کف خاکم سر برآورد ایں کہ برقے از جیب خیال در درخشیدن است برافروختن چراغ وقت خاموش گردیدن شدہ۔

ایک دوسرے خط میں بخار اور دردسر کے دور ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ضعف اگر باقی است تردّد نیست، چه ایں رفیقے است
کہ از وطن کمر بر رفاقتِ منِ زار بستہ ہم پایہ حق
گزارش قوی است وہم سایہ وفاداریش۔

سادہ باتیں اس ''سادہ کاری'' کے ساتھ ہیں جس میں دست وقلم اور کاغذ و قرطاس کا رشتہ عکس وآئنہ جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

''غالب نے پیش آنے والے واقعات اور نمود پزیر ہونے والے سوالات پر واقعہ نگاری اور معاملہ کی نزاکت پر تبصرہ کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ عبارت و اشارت کے لحاظ سے ان کی نگارش کو قابل توجہ اور لائق تحسین بنا دیتا ہے بیان کی صداقت و دل آویزی ان کے اپنے حسن بیان کی دین ہے۔''

الہ آباد اور بنارس جیسے شہروں میں وقتی قیام کے تاثرات ان کے ذہن پر کیا تھے ان خطوط کے مطالعے سے ہم ان شہروں کے تقریباً ڈیڑھ دو سو برس پہلے کے ماضی میں سفر کر سکتے ہیں۔

غالب نے شہر اِلہ آباد کی ہجو لکھی ہے اور اس پر اپنے قلم کی بہت سی جنبشیں صرف کی ہیں۔

روز ہفتم بہ ویرانۂ آباد، ورَودا ُفتاد، آہ از الہ آباد.....کہ نہ
دردے را دوائے در خور بیمار و نہ متاعے شایستہ مردُم
بازار حسن مردوزنش ناپیدا و مہرد آرزم درونا

ہویدا... سوادش سرمایۂ روسیاہی آفاق..... چہ ناانصافی
است این وادی ہولناک را شہر نامیدن.....بخدا اگر
بازگشت از کلکتہ منحصر درراہ الہ آباد باشد جز بہ ترکِ وطن و
راہ معاودت ندیدم۔ بالجملہ یک شبانہ روز بہ جرم فقدان
بار برداری، زندانی بودہ، روزِ دگر چوں بہل بہ کرایہ
پیدا شد، سحر گاہاں بر ساحل گنگ ،زود چوں باد از آب
گزشتم۔

بنارس ان کو پسند آیا بلکہ اس حد تک پسند آیا کہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے اور اس کی تعریف میں ایک خوبصورت مثنوی بزبان فارسی لکھی اور اُسے ''چراغِ دیر'' کے نام سے یاد کیا۔

بنارس کو خراج تحسین و نذرانۂ عقیدت پیش کر کے انہوں نے ایک نظر افروز و دل آویز روایت کو دہرایا۔ جو مرزا بیدل اور شیخ علی حزیں کی یاد کو تازہ کرتی تھی۔

اس موقع پر غالب نے اس کی ابتدائی حصہ کے بارہ شعر بھی پیش کیے ہیں اور اس کے بعد لکھا:

''بحکم و فور زدل فریبی غمِ غربتم از دل فراموش است و بہ
ہجوم نشاط نالۂ ناقوسِ ایں صنم کدہ دل از اہتزاز در خروش،
ذوق، آں قدر، سرمستِ بادۂ تماشا، گشت کہ بے خودانہ
دامن بر یاد وطن افشاندہ۔ کیفیت نظارۂ ایں جا بہ حدے
دل را فرو گرفت کہ دہلی را بجز طاق نسیاں جائے نہ ماند''۔

کلکتہ پہنچ کر مرزا نے اطمینان کا سانس لیا یہ شہر ویسے بھی ان کو بہت پسند آیا
کہ ایک نئی شہری تہذیب اور نئے تمدنی رویوں کا شہر تھا۔

یہاں غالب کو چھ روپے ماہوار پر، قیام کے لیے جو مکان کرایہ پر ملا وہ بھی
یہ کہیے قابل تعریف اور لائق شکر گزاری تھا،

کلکتہ کی جو تعریف غالب کی زبان پر آئی اس کا تعلق وہاں کی نئی شہریت اور
شہری تہذیب کے منظر نامہ سے تھا یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کے بارہ میں وہ اس
دارالریاست کی نسبت سے کیا تاثرات رکھتے تھے۔ یہ بات اس لیے زیادہ اہم ہے کہ
وہ اکبرآباد (آگرہ) اور دہلی جیسے تاریخی شہروں سے بخوبی واقف تھے نیز لکھنؤ کے نئے
ریاستی شہر سے ہوتے ہوئے گزرے اور وہاں پہنچے تھے۔

انگریزوں سے ''بیگانگان بعید الوطن'' کے طور پر اگر ایک طرف نفرت کی
جاتی تھی تو دوسری طرف ان کے حسن انتظام کو بنگاہ تحسین، دیکھنے والے بھی موجود
تھے۔

.....

مشتملات

۱۔ (۱/۱) فرمارِوائے کشور آگہی۔
۹۰ سطریں بشمول عبارات بہ صنعتِ تعطیل۔
۲۔ (۲/۳) قبلۂ قبلہ پرستان۔ وکعبۂ حق پژدہاں (۳۸ سطریں)
۳۔ (۲/۳) قبلہ وقبلۂ جان ودل سلامت۔
(۲/۳) قبلہ وقبلۂ جان ودل سلامت (۹ سطریں)

۴۔ (۴/۴)۔ مشتمل بر ہجو اِلہ آباد و صفتِ بنارس (۱۲۳/سطریں)

۵۔ (۵/۶)۔ جناب فیض مآب قبلہ و کعبہ راستاں مدظلہ العالی (۴۰سطریں)

(ب) خطا بخش و عیب پوشِ من سلامت

۱۰۲ اشعروں پر مشتمل (۱۰سطریں)

۶۔ (۶/۲۰) قبلہ و قبلہ گاہِ من سلامت (۶۸سطریں)

۷۔ (۷/۱۸) قبلہ گاہا۔ بے کساں پناہا (۵۱سطریں)

۸۔ (۸/۲۱) قبلہ گاہا! (۱۲۹/سطریں)

۹۔ (۹/۱۳) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی، مدظلہ العالی

۱۰۔ (۱۰/۲۲)....خدا کہ ہنگامِ تحریرِ عبودیت نامہ

۱۰۔ (۱۰/۲۲) من دانم و خدا۔ (۹۶سطریں)

۱۱ (۱۱/۲۳) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی۔ (۹۰سطریں)

۱۲۔ (۱۲/۱۵) قبلہ گاہا۔

۱۳۔ (۱۳/۷) درمیان خط، دوشنبہ ہفتہ رجب کی تاریخ کا حوالہ ہے۔ (۱۶سطریں)

۱۴۔ (۱۴/۱۲) ولیم بیلی صاحب کے کلکتہ واپس آنے، اور دہلی میں مقدمہ پیش ہو جانے کی توقع کا ذکر ہے۔ (۵۶سطریں)

۱۵۔ (۱۴/۱۵) لالہ کانجی مل کے خط کا ذکر آیا ہے (۲۷سطریں)

۱۶۔ (۱۶/۸) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۳۲سطریں)

۱۷۔ (۱۷/۹) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۵۶سطریں)

۱۸۔ (۱۰/۱۸) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۴۹ سطریں)

۱۹۔ (۱۱/۱۹) حضرت قبلہ گاہی وہی نعمی (۳۲ سطریں)

۲۰۔ (۱۷/۲ـ) حضرت ولی نعمی (۳۷ سطریں)

۲۱۔ (۱۶/۲۰) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۱۰) سطریں)

۲۲۔ (۱۹/۱۲) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۱۰ سطریں)

۲۳۔ (۱۹/۲۲) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۳۴ سطریں)

۲۴۔ (۲۵/۲۳) یکم اگست کو بروز شنبہ، دربار عام میں شریک ہونے کا ذکر ہے (۵۵ سطریں)

۲۵۔ (۲۶/۲۵) کشتی میں، اپنے ساتھیوں سے خوش ہوں اور راہزنوں سے فکر مند۔

۲۶۔ (۲۷/۲۶) یہ خط اس جملے پر ختم ہوتا ہے:

چون طاقتِ من درین مرحلہ تمام شد۔ (۵ سطریں)

۲۷۔ (۲۸/۲۷) قبلہ گاہا بیکساں پناہا۔ (۹ سطریں)

۲۸۔ (۲۹/۲۸) اعلیٰ حضرت نواب صاحب، قبلہ و کعبہ کونین مد ظلہ العالی (۳۹ سطریں)

۲۹۔ (۳۰/۲۹) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی ۔ (۵۵ سطریں)

ماہ رجب رسیدہ باد۔ معروضہ پانزدہم جمادی الثانی ۱۱۴۵ ہجری

۳۰۔ (۱۱/۳۰) حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی (۲۲ سطریں)

۳۱۔ (۳۲/۳۱) قبلہ محرمان آفاق سلامت (۱۸ سطریں)

نامہ ہاے فارسی

کشورِ آگہی کے فرماں روا، میری راہ جستجو کی منزلِ مراد اور میرے جذبۂ اطاعت کے تئیں سجدہ گاہِ نظر۔

نذرانۂ سپاس و اداے کورنش کی بجا آوری کے بعد عرض پرداز ہوں کہ میرے مشفق و مہربان، میر کرم علی صاحب، جنابِ مخدوم کی طرف سے عذر قدم رنجہ فرمائی کے طور پر خود ہی زحمت گوارا کرتے ہیں اور اِس نالائق، ردِ خلائق کی جو (صورت و معنی کے لحاظ سے ہرگز قابلِ ستایش نہیں) اپنی زبانِ گوہر افشاں سے تعریف فرماتے ہیں۔

اس دردناک اذیت کے باعث کہ پاؤں، دل سے زیادہ خستہ و رنجور ہو گام فرسائی کی زحمت کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے، ہاں اِس قیامت خیز صدمہ کا بس تصوّر ہی ممکن ہے، اور وہ بھی کتنا تکلیف دہ ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اِس ننگِ آفرینش کو بزم قبول کی صدرگاہ میں بٹھلاتے ہیں اور اس کج فہم و ہیچ مداں کو، فارسی زبان کا

ایک عمدہ ادیب خیال فرماتے ہیں۔

اگر میں اس بے پایاں نوازش پر اظہارِ مسرّت نہ کروں تو یہ بھی کتنی بڑی ناسپاسی اور اس کی شکرگزاری میں اپنے محسن کے، مبارک قدموں کو اپنی آنکھوں سے بوسہ نہ دوں، تو یہ کیسی حق ناشناسی ہوگی!

میں کافی وقت کے بعد، حاضرِ خدمت ہوتا ہوں اسے ہرگز ہرگز میرے جذبۂ شوق اور جوشِ عقیدت کی کمی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ اس نارسائی کو میری ''نارسائی قسمت'' خیال فرمایا جائے۔ میری واماندگی کی ''عذر خواہی'' دراصل مری ''درماندگی'' اور ناتوانی کی شِدّت ہے جس نے بیمار کے بستر کی طرح میرے پیکرِ وجود میں بہت سی شکنیں پیدا کر دی ہیں۔

میرا جسم ہجوم ناتوانی وغم زدگی کے باعث، اس نازک اور مہین ریشمیں کپڑے کی طرح نظر آتا ہے جس پر ہوا سے اَن گنت سلوٹیں پیدا ہوگئی ہوں، مزید برآں یہ کہ اس خشک سالی اور برگ ریز (پت جھڑ) کے موسم میں تاب وتواں کا تصوّر بھی رنجِ سفر کے برابر ہے اور کامیابی کا خیال، ناکامی کے ہم معنی، عمر گزری، مگر کیا ہی ناخوش ونامراد گزری۔

چونکہ ''قوائے طبعی'' کے مضمحل ہونے کا نتیجہ نفس کی خواہشوں کا سکوت ہے اب دل کو ہوائے شعر سے ملال اور دماغ کو فکر سخن سے سرگرانی ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر جب کہ ہوائے شوق کے زیرِ فرمان میں بے پرواخرام، اور دلدادۂ رنگ وبو تھا، اپنی خوشیوں کے حصول میں آزادہ روی کو پسند کرتا تھا اور سیہ مستوں کی طرح صراحی کی بہتی ہوئی آگ کو پیمانوں میں اُنڈیلتا رہتا تھا۔

یاد باد آں روزگاراں کاعتبارے داشتم
آہِ آتش ناک و چشمِ اشکبارے داشتم

یاد ایام کہ جب چشمِ احباب میں مجھے اعتبار حاصل تھا
مری آہ، آتش ناک تھی اور میری آنکھیں اشکبار

اب وہ نفسِ شوق کی شرر کاری کہاں کہ انفاس کو شعلۂ دروں، سے محروم نہ رکھے۔ ''بہارِ اندیشہ'' کا وہ جوشِ فراوانی اب کہاں سے آئے کہ لالہ وگل میری کفِ خاک سے پیدا ہوں۔ اب بھی میری جیبِ خیال سے بجلی چمکتی رہتی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ خاموش ہوتے ہوئے چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش ہے۔ فی الجملہ ایسی فکر نارسا کی تحسین اور مجھ ایسے کسی 'رندِ لا اُبالی'' کی ستائش، عنایت فرمائی کی تمہید اور کرم گستری کے سلسلہ کی تکمیل ہے۔

حق بات تو یہ ہے کہ یہ ''ہیچ'' کو ''ہمہ'' کا درجہ عطا کر کے صورتِ قبول بخشنا ہے اور بد کو ''نیک'' کے خطاب سے نوازنا اسے ''بخششہائے عجیب'' میں شمار کیا جانا چاہیے۔

ایسی دونثری تحریریں جن میں سے ہر ایک کو کسی خاص تقریب سے ''زیبِ قرطاس'' کرنے اور حرف وقلم کے دائرہ میں لانے کی سعی کی گئی ہے۔ نظر کیمیا اثر سے گزریں گی۔ پہلی نگارش نامہ، ان ایام کی یادگار ہے جب میں دیارِ مشرق کی طرف، سفر اختیار کرنے سے پیشتر عمِ والا قدر، دِلاوُر الملک، فخر الدولہ، نواب احمد بخش خاں، رستم جنگ رئیس فیروز پور جھرکہ ولوہارو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور اس غرض سے فیروز پور گیا تھا کہ وہ میرے اس عالی مرتبہ چچا کی جاگیر تھی۔

یہ دراصل وہ "عذر نامہ" ہے جو میں نے اس وقت اپنے محبِ مکرم مولوی فضل حق خیرابادی کی خدمت میں، اِس مقصد سے، روانہ کیا تھا کہ میں شاہجہاں آباد دہلی سے روانگی کے وقت عجلت کی بنا پر رخصتی ملاقات نہ کرسکا تھا، اپنی منزل گاہ پر پہنچ کر مجھے اس کا خیال آیا اور اپنی اس نارسائی قسمت کے باعث آن محبِ صادق الولا سے اجازت نہ لے سکنے پر یہ پوزش نامہ (معافی نامہ) تحریر کیا جو "صنعتِ تعطیل" میں ہے۔

وہ کہ عالم العلما ہیں، علم وعمل کی خوبیوں سے آراستہ ایک لائق وفائق شخص ہیں، عدل وانصاف میں ممتاز اور فضل وکمال میں منفرد شخص ہیں۔ (اللہ پاک اُن کے لطفِ بے حد، اور عنایت بے نہایت کو ہمیشہ قایم رکھے۔)

یہ عالم عالم درد واندوہ کی جاے پناہ، بندۂ بے دستگاہ اسد اللہ، سلامِ مسنون الاسلام پیش کرتا ہے۔

عرضِ مُدّعا کے اِن بھیدوں کی شرح نگاری، کیسے ممکن ہو، سو عمریں بھی عطا ہوں اور ہر عمر کے ساتھ اس اندوہِ نارسائی و دردِ جدائی کا احساس بڑھتا رہے تو یہ ہر طرح روا ہے۔

اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں سرتاسر، گم کردہ حواس اور سرتاپا وہم وشواس کے عالم میں یہاں پہنچا۔ اگر اس پر، حضرت والا کا دل گلہ مند ہو اور خاطرِ عالی پر اس کی کوئی پرچھائیں گزرے تو میرے لیے کس قدر تکلیف وندامت کی بات ہوگی۔

جب حضرتِ آدم نے، حضرت باری میں، کیے گئے اپنے عہد کو فراموش کیا اور اپنی عمر کو آرزومندی کے تقاضوں کی نذر کردیا۔ روح کو "ہوسِ نشاطِ کار" سے خوش

وقت کیا اور دل کو ''حرص و آز'' کا محور بنا دیا تو معاملاتِ دنیا میں کم نصیب و کم قسمت قرار پائے۔ خدائی احکام کے بارے میں ان پر ''سہو و خطا کا عالم'' طاری ہوا اور وہ ''آخرت'' کو بھول گئے۔

ایک ایسے انسان کے لیے جو ''دلِ آگاہ'' رکھتا ہے ''اصلاح کار'' آسان ہوتی ہے اور گمراہی میں پڑے ہوئے آدمی کے تئیں بسا مشکل، بلکہ محال۔ ایزد پاک جو دلوں کے بھید جانتا اس سے آگاہ اور میری، دکھوں سے بھری ہوئی ہر سانس اس کی گواہ ہے کہ میں حرص و ہوس کا محفل نشین ہو گیا ہوں اور میرے دلِ حسرت منزل ''پر گردبادِ ملال'' بے طرح چھا گیا ہے اور اس نے مجھے ''ورطۂ ہلاکت'' میں ڈال رکھا ہے۔ میری عمر ہے کہ تِل تِل بڑھ نہیں رہی بلکہ پل پل گھٹ رہی ہے۔

واللہ باللہ میں نے عہد کر لیا ہے اگر مجھ میں ذرا سی بھی خوے مردمی ہے، حوصلہ و ہمت باقی ہے تو آئندہ اس طرح کے لہو و لعب سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔ جو ''سالکِ راہ'' ہوتا ہے وہی تو منزل تک پہنچتا ہے۔

میرے مخدوم مکرم، اس وقت کہ راقم نے دلاورُ الملک کے، درِ دولت کو اپنی توقعات کے تئیں ''دامگاہِ مرادات'' بنایا ہے اور میں اس ''طمع'' میں یہاں آیا ہوں، کہ میں ساہوکار کے روپیہ کو رئیس حال کے علم و اطلاع میں لاؤں اور اس کے بعد اپنی راہِ سفر.... کا رُخ مرحلہ پیمائی کی طرف موڑ دوں، تا کہ میرا یہ دل کہ دشمن کے ارادوں پر والہانہ رقص کرتا ہے، دشت و صحرا میں جا کر کچھ بہل جائے۔

میرے عمِ عالی قدر و نوابِ والا القاب نے اس وہم و گمان کے زیرِ اثر جو میرے دشمنوں نے خوف و ہراس کی طرح ان کے دل میں بٹھا رکھا ہے سرکارِ سرمور

سے محصولات کے وصول نہ ہونے کے باعث عذر کیا نیز گرمی کے موسم کی آمد آمد کے خیال نے مجھے سرگرم وسوگوار بنا دیا.... میں خود کو ''گم کردہ آرام'' محسوس کرنے لگا۔

ان میں وہ مہر و محبت کہاں کہ کسی کی دل دہی کریں اور اپنی ہمتوں کو کسی کے اصلاح حال پر توجہ فرمائی کی اجازت دیں اور میں دل سودا زدہ کو رام کرسکوں، آرام و آسایش کے کچھ لمحے اُسے دے سکوں۔ اور اپنی خاطر پریشاں کو آسودگی بخش دوں۔ بات اس کے برعکس ہے میں اپنے سر وحشت زدہ کو کہ درد و غم کے باعث ایک لمحہ کو سکون نہیں پاتا، کس پتھر کدے میں لے جاکر ٹکراؤں اور دلِ حسرت منزل کو امدادِ کار کی طمع اور امید و ناامیدی کے بھنور میں ہچکولے کھانے دوں۔

حاصل کلام یہ کہ میں اپنے مزاج کو قسمت کی گلہ گزاریوں سے آزاد کر کے اور کرمِ ایزدی پر توکل کو کلاہِ فخر کی طرح اپنے سرِ بے سایہ پر سجا کر اور اپنے وجود پر صحرا نوردی کا احرام باندھ کر صحرا کے بگولے اور دشت کی تیز آندھی کی طرح سرگرم سفر ہو جاؤں اور خود کو آوارۂ عالمِ نامرادی ٹھہراؤں۔

اگر میرے مقدّر نے یاوری کی، اور طالعِ نامسعود سازگار ہوئے (کہ طلسمِ مراد کی لوح اسی کے دستِ تصرّف میں ہے) اور ''عروسِ مُدّعا'' اس ارادت مند و دعا گو کے آئینہ نگاہ میں جلوہ افروز ہوئی تو میری آنکھیں روشن اور میرا دل خوش ورنہ پہلے ہی قدم پر راہِ عدم تو گویا سامنے ہوگی۔ اور میں اس پر گامزن۔ (کہ کشود کار کے سلسلہ میں تمام نبی نوعِ آدم کے واسطے باعثِ ننگ ہوں) الملک اللہ والحکم اللہ۔''

صرصرِ وہم و دمِ سرد آمد دل   ہم درد و ہمہ گرد آمد دل
گہ کرم، کام دلِ ماگردد   گہ درم دامِ دل ماگردد

ہوسِ طرّۂ طرّار او را   حرصِ وصل و سرِ دلدار اورا
سادہ دِل گرد ہوسہا گردد   گہ عسل دام مگسہا گردد

.....

میرا دل، صدہا سرد آہوں سے پیدا شدہ صرصر ہے اور دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ہزار پریشانیوں سے بھرا ہوا میرا دل، کبھی تمام تر، درد والم ہے اور کبھی ''گرد باد کا طوفان''، کبھی اُس کا کرم میرے مقصدِ دلی کو پہنچتا ہے اور کبھی نقشِ دِرم میرے دل کے تئیں حلقۂ دام بن جاتا ہے، کبھی وہ زلفِ صنم کی ہوس میں مبتلا ہوتا ہے کبھی محبوب کے وصل کے خواہش اُسے دیوانہ بناتی ہے۔

وہ سادہ دل ہے لیکن کوچۂ ہوس کا طواف کرتا رہتا ہے اور شہد کے چھتے کی طرح مکھیوں کے شکار کے لیے حلقۂ دام کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک سوداگر کے معاملہ نے جسے ''ولد الحرام'' کہنا چاہیے، اس کم قسمت کے حق میں جناب والا کے دل کو جو محبت کی گرم جوشیوں سے تپتا رہا ہے بالکل سرد کر دیا اور اپنے حسد سے بھرے ہوئے کلام کو کہ مثل تلوار کے جس کی دھار، دلوں کو کاٹتی ہے، سرتاسر وجہ آلام بنا رکھا ہے اور ملال کی گرد آپ کی پاکیزہ طبیعت پر بیٹھی ہے۔

اب یہ اُمید کرتا ہوں کہ یہ گردِ ملال ہوا ہو جائے گی۔ اور توقع یہ ہے کہ دل کی گرہ کھل جائے گی کہ میرا دل، دامِ مُدّعا کے حلقوں کی طرح گرہ در گرہ ہو رہا ہے ایزد پاک کہ تمام تر، رحمت اور مہربانی کا سرچشمہ ہے طول عمر کو اِسی نسبت سے گرہ بگرہ بنائے اور اصلاح حال کی توفیق ارزانی فرمائے والسلام مع الاکرام۔

.....

دوسرا مسودہ، یا نگارش نامہ وہ ہے جو راقمِ حروف نے سبحان علی خاں و میر نیاز حسین خاں، نیز دوسرے نئے دوستوں کی فرمایش سے لکھنؤ میں ترتیب دیا اور اسے بطور عرض داشت معتمد الدولہ آغا میر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

ہر چند اس سرکار کے ممتاز اہلِ دربار نے یار فروشی کے انداز کو اختیار کیا اور امیر موصوف سے مجھے متعارف کرایا۔ ملاقات کا وقت بھی طے ہو گیا، لیکن چونکہ معانقہ، اندازِ پذیرائی نذر کی پیش کش اور دوسرے اُمور کے بارے میں اس طرف سے کچھ ایسی شرطیں عائد کی گئیں کہ پہلی ملاقات ہی ممکن نہ ہو سکی معانقہ اور دوستانہ ملاقات نیز رسائی واستقبال کی کوئی صورت نہ بن پائی۔

بندہ کا دل ان بہت سی باتوں کے خیال سے زخمی تھا اور ایک سفرِ دور و دراز (اور مطلبِ دشوار) درپیش تھا، میں نے بے نیازانہ طور سے اس معاملہ کو لیا اور اپنی خاکساری کی آبرو کو پیشِ نظر رکھا اور ان ''بے مدار'' نو دولتوں کے ساتھ اختلاط سے، دامن کشی و دست برداری اختیار کی۔

اگر چہ اس ہوسِ دلی کا نقش سینۂ بے کینہ سے محو ہو گیا لیکن وہ تحریر قلمی بیاضِ میں موجود ہے اپنے قلم پریشاں رقم کی زبانی عرض کرتا ہوں۔

!

ایزد پاک (کہ سرتا سر رحیم و کریم ہے) آپ کی ذاتِ والا صفات کو کہ کرم فرمائیوں کے واسطے وجہ ظہور اور نقشِ مراد کے لیے طالع مسعود ہے۔ عطا و بخشش کے تئیں مطلع نور اور جو عطا و بخشش کے تئین دودمان آدم کے واسطے سبب افتخارِ وجود ہے، قائم رکھے اور آپ کی عطا و بخشش کو طرازِ دوام عطا فرمائے اور رتبۂ بلند کو مزید بلندیاں

ارزانی فرمائے۔ آمین۔

یہ دعا گو، محمد اسد الہ، مدحِ نگاری کے مراسم کی ادائیگی کے بعد، دردِ دل کے ریشمی دھاگے کی گرہ کھولتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ یہ نامراد اطلاع احوال کے وسیلہ سے ، گوہر مراد کے حصول کی تمنا میں ''ساحلِ اُمید' پر کھڑا ہوا ہے۔

میرے دردِ دل نے اپنے ''سحر زدہ'' سانسوں کے اثر سے میرے وہم وجود کو برف کی سِل میں بدل دیا ہے اور دلِ سودازدہ سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل نے مور کی پھیلی ہوئی دُم کی طرح اُسے داغ درداغ بنادیا ہے۔ دل کم حوصلہ نے عالم عالم درد و کرب کو صلادی اور وہم و ہراس نے صحرا صحرا وسوسوں سے بھرے ذہن کو المانکیوں کی گرد اور غبار ملال سے ڈھک دیا ہے۔ قوّتِ سامعہ سماعت سے محروم اور قوتِ لامسہ درک واحساس سے دور ہے، دستِ مدّعا کے تئیں رسائی کی راہیں مسدود ہوگئیں اور یہ محسوس ہونے لگا کہ اس دنیا میں رسم وراہ کرم باقی نہ رہی۔

اس فقیر دعا گو کے لیے دروازہ بہ دروازہ مدد کا سوال باعث ننگ وعار ہے اور دوسری طرف ارباب ہمّت کی کرم گستری نگاہِ لطف سے پوشیدہ نہیں، ہر آدمی ہوس کے ہاتھ پھیلائے اِدھر اور اُدھر دوڑ رہا ہے۔ میرے سر کے واسطے کہ درد والم کی آماجگاہ بنا ہوا ہے کوئی درودیوار ایسی نہیں کہ جس سے اسے ٹکرایا جائے، بجز سرکار اودھ کے جو ''مرکز دین وداد'' ہے اور جس نے زمین دہر کو گل کدۂ اِرم بنا رکھا ہے۔

اس دولت ابد پیوند کے عطا و بخشش نے ایک برسنے والے بادل کی طرح وقت کی بادِ سموم کے جھلسے ہوئے دلوں اور خشک دماغوں کو حصول مدّعا کی نسیمِ خوشگوار کے جھونکوں سے تازہ دم کیا ہے، میں نے بھی کہ درِ امید سے وابستہ ہوں، اس ارادہ

سے ادھر رخ کیا ہے کہ اس بارگاہ تک رسائی کے ذریعہ کہ نمونۂ بہشت ہے، گلِ مراد کے حصول اور عطر و پان کی پیش کش سے اپنے دامانِ دل کو عطر بیز۔ اور ''ملبوسِ ہوس'' کو اس خوشبو سے گلریز کروں۔

غرض کہ تمناؤں کے تیر اپنے زخم سینہ میں پیوست کیے اور طرح طرح کے اوہام کا دھواں اپنے سرِ سودا زدہ میں لیے ہوئے میں اس دور و دراز سفر پہ نکل کھڑا ہوں اور سفر کے اس مرحلہ میں کسی ''راہوار'' کا متلاشی ہوں۔

ایزدِ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں دو صد کوس کی منزلیں طے کر کے سلسلۂ آل محمدؐ کے ایک فردِ فرید کے درِ دولت تک پہنچ گیا ہوں۔ اگر چہ میں عرصہ گاہِ عالم میں، اہل فضل و اربابِ کمال کے قافلہ کی گرد اور سرِ راہ طلب مُشتِ غبار کی حیثیت رکھتا ہوں۔ مگر ''گرد کردار'' اور ''پروردۂ غبار'' ہونے کے باوجود میں اس سرکار ابد مدار کا مدّاح ہوں اور اپنی تحریر کی لڑیوں میں وہ موتی پرو کر لایا ہوں جو بادشاہوں کی نذر کے لائق ہیں۔

میرے دل نے کہ غُبارِ ملال میں زاویہ نشین ہے خلوص و خصوص کی طرح ڈالی ہے اور میرے قلم نے جو ستارۂ عُطارِد کا کردار رکھتا ہے۔ دس عدد سادہ مصرعے سلک مسطر میں پروئے ہیں۔

اکرمِ اہل کرم اسعدِ اولادِ رسول

داور داد رس و سرورِ عالم آرا

درِ او مصدرِ عدلِ و کرم و سود و سرور

دلِ او مطلع علم و عمل و مہر و عطا

علم را، راہ درِ درگہ او کردہ طلوع
مُلک را گرد رہِ عِسکرِ او دادہ لوا
گر دود گردِ سُمِ تو سمِ او در عالم
ہر حس خام طلا گردد و ہر صعوہ ہما
درِ او آمدہ در گاہِ ملوکِ عالم
کہ گدا آمدہ کاؤس و دعا گو دارا

اس کا دروازہ مرکزِ عدل و داد اور سرچشمۂ مسرت و شادمانی ہے اس کا دل علم و عمل کا مطلع ہے اور عطا و بخشش کے لیے کنارۂ آسمان۔

اس کے لشکر کے گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد، اس کی درگاہ کو جانے والی راہ مشرقِ تابندہ کی وہ افق ہے، جہاں سے عدل و انصاف کا سورج طلوع ہوتا ہے اور لشکر کی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا ہے اگر اس کے اسپ راہوار کے سُموں کی گرد اڑے اور سیمِ خام (کچی چاندی) پر بیٹھ جائے تو اُسے زرِ خالص (کھرا سونا) بنا دے اور اگر اس چھوٹی سی چڑیا کو چھو لے جسے ''پودنا'' کہتے ہیں تو وہ ''ہما'' ہو جائے۔

اس کا درِ دولت ملوکِ عالم کی سجدہ گاہ ہے کوئی فقیر اس دروازہ پر آتا ہے تو ''کیکاؤس'' بن جاتا ہے اور درویش بے نوا، دارا حشم ہو جاتا ہے۔

اے داورِ دادگر، میری روح غم و الم کی زنجیروں میں گرفتار ہے۔ میرے بخت سیاہ کا زہر آلود خنجر تا بہ استخواں پہنچا ہے، (میرے دل کی گہرائیوں تک اُتر گیا ہے) اور میرا دل کہ محرم درد ہے دوا سے محروم ہے۔ وہ مرہم کی آرزو میں تڑپ رہا ہے اور اس دستِ شفا بخش کا منتظر ہے جو میرے دامن دل سے گردِ ملال کو دھو ڈالے۔

امید یہ کہ جناب والا کی سرکار ابد قرار میں میری تحریر کے اس سحرِ حلال اور گوہرِ کمال کو مشاہدۂ والا سے گزرنے کا شرف حاصل ہوگا اور اس ''سِلکِ مروارید'' کا مشاہدہ کیا جائے گا۔ تا کہ یہ ستارۂ بے نور، ماہِ درخشاں کا ہم طالع اور یہ مگسِ بے مایہ ہم سایۂ ظلِ ہما ہو جائے۔

نواب معتمد الدولہ آغا میر کی ذات، محبتوں کا رشتۂ اِتمام ہے یعنی وہ حکاّم میں بڑے رتبہ کا حاکم ہے عالم اور اہلِ عالم میں ممتاز ہے اہل کرم و بخشش کا سرگروہ ہے عمدۃ الامرا ہے ''مدار المہام سلطنت ہے'' اور عالی ہمّت ہے۔

ایزد پاک اسے ایسی عمر عطا فرمائے جس کی بنیاد، دوام (ہمیشگی) پر ہو ایسا حکم ارزانی فرمائے، عالم جس کا تابعِ فرمان ہو اور ایسی قوّت نفوذ برائے حکم واحکام دے کہ دشمن جس کے سامنے پگھل کر رہ جائے۔ دل جو ناآسودگیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بخشایشیں اس کے حال پر ہوں، اور دائماً اور دواماً (ہمیشہ ہمیشہ) رہیں۔

محمد اسد اللہ

ایں شکایت نامۂ آوارگی ہاے من است

قصّہ دردِ جُدائیہا جُدا خواہم نوشت

یہ شکایت نامہ تو میری آوارہ خرامی کے ذکر پر مشتمل ہے، درد جدائی کا قصہ تو میں الگ سے لکھوں گا۔

روح روانِ اسد اللہ، عقل و خرد کے قبلہ گاہ، جسم و جانِ غالبِ مغلوب اور کعبۂ راہِ مقصود سلامت باشند، تمنائے قدم بوسی کی پیش کش اور مراسمِ تسلیم و تصدّق کی

ادائیگی کے بعد خدمتِ والا میں عرض پرداز ہوں کہ آج سے دو روز پہلے یہ، نیازمند' حاضران غائب میں سے تھا تو اب دو دِن گزرنے کے بعد غائبانِ حاضر میں سے ہے۔

عالمِ خیال میں ہر لحظہ، میں خود کو اس انجمن کے حاشیہ نشینوں میں شمار (تصور) کرتا ہوں اس وقت جناب والا کے ''ذوقِ ہم کلامی'' کو اپنے دل میں جوش زن پا رہا ہوں اور اپنے کو آپ سے گفتگو کے شوق میں محوِ خروش محسوس کر رہا ہوں ناچار اپنے گریبانِ تحریر کو چاک کر رہا ہوں اور خونابۂ گفتار کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دینا چاہتا ہوں۔ یہ سمجھیے کہ مجھ پر ''شیریں دیوانگی''۔ جیسی ایک حالت وارفتگی طاری ہے میں دردمند ہوں اور قابل معافی اور یہ جو کچھ ہے اُسے ایک مرفوع القلم یعنی سیدے سادے انسان کی ہرزہ سرائی خیال فرمائیں۔

تکلّف برطرف واردات غالب میں سے جو کچھ شایستۂ اظہار اور قابل ابلاغ ہے، وہ یہ ہے۔

مغلوب سطوتِ شُرکا، غالبؔ حزیں
کاندر تنش، زِضعف تواں گفت، جاں نبود
گویند زندہ تا بہ بنارس رسیدہ است
مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

غالب افسردہ طبیعت جو اپنے شرکاے معاملہ کی سطوت سے مغلوب ہے، اور جس کے تن ناتواں میں ضعف کے باعث یہ کہیے کہ جاں ہی باقی نہیں۔
اب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ بنارس تک پہنچ گیا ہے۔ ہم کو تو اس کمزور تنکے پر

ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ یہ سب کر پائے گا۔

جو کچھ ''چلہ تارا'' تک گزرا وہ اس سے پیشتر عریضوں کی صورت میں لکھ کر بھیج چکا ہوں ایک گاڑی بان کی معرفت روانہ کیا گیا ہے اور دوسرا ایک مجہول الاحوال اور نا آشنا شخص کے بدست امید کہ یہ عریضے نگاہ قبول تک پہنچ چکے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ وہاں سے ایک کشتی کرایہ پر لی، اور آدمیوں اور اشیاے خوردنی کے ساتھ اس میں سما گیا معدے اور آنتوں سے پیدا ہونے والی ریاح کے باعث پیچ و تاب اور کشاکش میں مبتلا رہا بخار کی حرارتِ غریبہ کے باعث جسم گویا آگ میں جلتا رہا۔ سات دن کے سفر کے بعد اس ویرانہ آباد میں پہنچا جسے الہ آباد کہا جاتا ہے۔

آہ آہ یہی اِلہ آباد ہے اس خرابے پر خدا کی لعنت کہ یہاں نہ بیمار کے لائق کوئی دوا اور نہ ایسے کسی مریض کے کھانے کے لیے کوئی غذا....نہ ایسی کوئی شے جو کسی شریف آدمی کے قابل ہو یہاں کے لوگ بزم آرائیوں کو جیسے جانتے ہی نہیں اس کے پیر و جواں میں مہر و مروت کی ''خوبو'' کہیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔

اس کا سواد ''سرمایۂ روسیاہی'' ہے جس کی نظیر کہیں اور کاہے کو ملے گی یک منزلہ و دو منزلہ مکانات کی بات کون کہے کہ وہ کیسے ہیں ان کو مکان کہنا بھی ناانصافی ہے اور اس ''وادی ہولناک'' کو شہر کہنا بڑی دیدہ دلیری ہے....آدم زاد کے لیے اس دامگاہ میں آرام لینا ''غولِ بیابانی'' کے ساتھ وقت گزاری کے ہم معنی ہے۔ صحن جہنم اسی لیے انگاروں سے بھرا ہے کہ اسے اس 'مرز بوم' کے مقابل میں رکھتے ہیں اور کرۂ زمہریر کی ہوائیں اس لیے اندوہ آگیں ہیں کہ انہیں اس ''یخ کدہ'' کی بادِ تند و تیز سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

آپ کے اس نیاز مند نے چونکہ سن رکھا ہے کہ بدوں کو نیکی کرنے والوں کے بدلے میں بخش دیا جاتا ہے، خود کو بہ ہزار اُمیدواری بلکہ بصد ہزار خواری پہلوے بنارس میں لاکر ڈال دیا۔ اور رودِ گنگ کی لہروں کو سفارش کے لیے اس کے پاس روانہ کیا ہے۔

اگرچہ اس روسیاہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بنارس کی طبع نازک پر گراں ہوگا۔ لیکن اس ہوا خواہی کی توقع پر اس کا دل پسیج سکتا ہے کہ گنہگار کا نامقدس پاؤں درمیاں ہے، بخدا، اگر کلکتہ سے، بازگشت پر، اِلہ آباد سے گزرنا ناگزیر ہوا تو میں مراجعت وطن کا خیال ہی ترک کرسکتا ہوں، اور واپسی کے اِرادہ سے خود کو باز رکھ سکتا ہوں....

قصہ مختصر یہ کہ ایک دن اور ایک رات اس سرزمین میں جو جنوں اور بھوتوں کے رہنے کے لیے ہے، اس وجہ سے ٹھہرا رہا کہ باربرداری کے وسائل کا فقدان تھا اس جرم میں قید اور قید خانے کی طرح اس وقت کو میں نے گزارا دوسرے دن جب ایک بیل گاڑی کرائے پر مل گئی تو صبح کے وقت میں گنگا کے ساحل پر پہنچا۔ بہت جلد ہوا کی طرح پانی کی سطح سے گزر گیا اور پائے شوق کے سہارے بنارس کی طرف میں نے سفر اختیار کیا اور تیز روی کے ساتھ آگے بڑھا۔ ورودِ بنارس کے دن جاں فزاں ہوا اور روح کو آسائش پہنچانے والی نسیم سحر مشرق کی طرف سے چلنا شروع ہوئی اور میری جان کو توانائی اور دل کو طمانیت بخشی۔ اس ہوائے جاں فزا کی اعجاز نمائی کی برکت سے میرا غبارِ وجود علمِ فتح کی طرح بلند ہوا اور اس روح افزا ہوا! کے جھونکوں کے باعث مجھ میں ضعف ونقاہت کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ کیا کہنے ہیں سوادِ بنارس کے کہ اگر اُس کی دِل

آسائی کے باعث اس کو دلِ عالم کا ''سویدا'' قرار دیں تو یہ بیجا نہ ہوگا۔

سبحان اللہ شہر۔ اس کے اطراف کے سبزہ و ریاحین اور لالہ و گل کی کثرت کے سبب، اس شہرِ آباد کو بہشتِ روے زمین سمجھ لیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس کی ہواؤں کی خدمت یہ مقرر کی گئی ہے کہ وہ مردوں کے قالب میں روح پھونک دیں اور اس کی خاک کے ذرّہ ذرّہ کو جو کہربا کی سی خاصیت رکھتا ہے، یہ منصب سونپا گیا ہے کہ وہ مسافروں کے قدموں سے کانٹے نکال پھینکے۔ رودِ گنگا کو اگر اس شہر جمیل کے قدموں کو بوسہ دینے کا موقع نہ ملتا تو اہلِ عقیدت کی نظر میں اس مقدس دریا کی یہ قدر و منزلت بھی نہ ہوتی۔

اگر سورج اس کے در و دیوار سے نہ گزرتا تو اس طرح روشن و تابناک بھی نہ ہوتا۔ دریاے گنگا کی لہروں میں وہ جوش و خروش دیکھنے کو ملتا ہے کہ آسمانوں کی بلندیوں پر رہنے والے فرشتوں کی فرودگاہوں تک اس کے چھینٹوں کا اثر پہنچتا ہے۔ اور اس شہرِ حسین کے جو سبزہ رنگ اور گُل رخسار باشندے ہیں ان کے چہروں کی چاندنی فرشتوں یا ملاے اعلیٰ کے رہنے والوں کے ریشمین خیموں کو، جو کتاں سے بنے ہوئے ہیں پارہ۔ پارہ کرتی نظر آتی ہے۔

اگر اس جلوہ گاہ کی عمارتوں کی کثرت کا میں ذکر کروں تو ق سے ق تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سچ یہ ہے کہ یہ سرتاسر اہلِ شوق اور اربابِ ذوق کا صنم زار ہے۔ اس کے اطراف و جوانب میں سبزہ و گل کی جو کثرت ہے اگر میں اس کا ذکر کروں تو بیاباں در بیاباں بہاروں کی سیر کا لطف آئے:

تعالیٰ اللہ بنارس، چشم بد دور

بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور
خس و خارش گلستان است گوئی
غبارش جوہر جان است گوئی
سروشِ پای تخت بُت پرستاں
سراپایش زیارت گاہِ مستاں
بنارس را کسی گفتہ کہ چین است
زموجِ گنگ، چینش بر جبین است
بخوش پرکاری طرز وجودش
ز دہلی می رسد ہر دم درودش
بہشتے را تو گوئی دید در خواب
کہ می گردد زِ رودش در دہن آب
حسودش گفتن آئینِ اَدب نیست
و لیکن غِبطہ گر باشد، عجب نیست
فرنگستانِ حسنِ بی نقاب است
زخاکش ذرّہ ذرّہ آفتاب است
بُتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور
سراپا نورِ ایزد چشم بد دور
میانہا نازکِ و دِلہا توانا
زِ نادانی، بکارِ خویش، دانا

تبسّم بسکہ در دلہا طبیعی است
دہن ہا رشک گلہای ربیعی است
بلند، افتادہ، تمکینِ بنارس
بود براوج او، اندیشہ نارس

سبحان اللہ شہر بنارس۔ چشم بد دور اِس شہر کا حسن اور اس کی خوب صورتی جسے بہشت جمیل اور ''فردوسِ معمور'' کہنا چاہیئے اس کے خس و خاشاک گل وگلزار کا حکم رکھتے ہیں اور اس کا غبار اکسیرِ دل و جاں ہے یہ بت پرستوں کا پایۂ تخت ہے اور سر چشمۂ فکروفن اس شہر کی فضا اور ہوا اہلِ شوق کی زیارت گاہ ہے۔

بنارس کے لیے کوئی کہتا ہے کہ یہ ''بُت خانۂ چین'' ہے اور دریائے گنگا کی موجوں کے باعث اس کی پیشانی پر خوب صورت شکنیں پڑی رہتی ہیں اس کے طرزِ وجود کی خوشنمائی اور دِل آسائی کی وجہ سے، شہرِ دہلی سے برابر اس کو دُعا و درود پہنچتی رہتی ہے اگر شہرِ بنارس کو کوئی خواب میں دیکھ لے تو گنگا جیسی رودِ آب کا خیال کر کے منہ میں پانی بھر آئے اگر اس کو یہ کہا جائے کہ ساری دنیا اس پر حسد کرتی ہے تو وہ آئین ادب کے خلاف نہ ہوگا۔ لیکن اس میں اگر ذہن تھوڑا بہت مغالطے میں مبتلا ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔

فرنگستان کی طرح وہ حسنِ بے نقاب کا دیار ہے۔ اور اس کی خاک کا ذرّہ ذرّہ سورج کی طرح چمکتا ہے اس کے بُت شعلۂ طور کے ہیولیٰ کو پیش کرتے ہیں۔ چشم بد دور، وہ سرتا پا نورِ ایزدی ہے۔ اس شہر کے حسینوں کو دیکھو تو ان کی کمر رگِ گُل کی طرح نازک ہیں اور ان کے دل یہ کہیے کہ پتھر کے بنے ہیں یہ بھولے بھالے اور معصوم نظر

آتے ہیں لیکن دل لینے اور نظر چرانے میں بہت ہوشیار ہیں۔ ان کے لبوں کی مسکراہٹ پھولوں کی طرح بالکل فطری ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لب بہار کے شگوفوں سے مشابہ ہیں۔

بنارس کی اپنی خوے تمکنت وناز کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس کی بلندیوں تک تو اندیشہ وخیال بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اس تماشا گاہ کی دلفریبی کے باعث میرے دل سے غریب الوطنی کا خیال محو ہوگیا اور میں اپنے وطن سے دوری کو بھول گیا۔ یہاں معبدوں سے جب نغمۂ ناقوس بلند ہوتا ہے تو اس کی نشاط آفریں آواز میرے دل میں عجیب اہتزاز اور مسرّت کی لہر پیدا کرتی ہے۔ یہاں میرا ذوقِ تماشا کچھ اس طرح سرمستِ دیر ہوا کہ میں نے اس عالم بے خودی میں یادِ وطن کو اپنے دل سے گردِ دامن کی طرح جھاڑ دیا اور اس شہرِ جمیل کی کیفیتِ نظارہ کے باعث طبیعت کچھ اس طرح خوشی وشادمانی میں گھر گئی کہ دہلی کے لیے طاقِ نسیاں کے ماسوا کوئی جگہ باقی نہ رہی۔

یہ عجیب صورت حال ہے کہ میرا دِل دشمنوں کی طعنہ زنی کے خوف سے زخمی نہ ہوتا تو میں اپنا دین چھوڑ دیتا، تسبیح توڑ دیتا، اپنی پیشانی پر قشقہ لگالیتا اور اپنے دوش کو تارِ زُنار سے آراستہ کرتا اور اس وضع کے ساتھ اتنے دن گنگا کے کنارے بیٹھتا کہ ''آرائش ہستی'' کی گرد اپنے دل سے دھوڈالتا اور قطرے کی طرح دریا میں مل جاتا۔

یہاں پہنچ کر جس کو ''ارم آباد'' کہنا چاہیے بغیر اس کے کہ میں کوئی علاج کروں یا دوا کھاؤں جن عوارض نے مجھے گھیر رکھا تھا اُن کی تشویش میرے دل سے دور ہوگئی بلکہ میں یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اصل مرض میں بھی تخفیف محسوس کر رہا ہوں جو

مرکب دوائیں معمول کے مطابق کام میں لائی جا رہی ہیں ان کا سبب بھی حزم (احتیاط) ہے ورنہ اس وقت تو یہ حال ہے کہ نہ ماضی کی تکلیفوں کی تلافی منظور ہے نہ رعایتِ حال۔

میرے قبلہ گاہ! ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ غالب کا دل خیرہ سری اور پریشاں نظری کے باعث بنارس میں اس طرح پھنس گیا ہے جیسے کہ مکھی شہد میں پھنس جائے۔ اور پھر مجھ ایسے کسی افلاس زدہ اور مصیبت میں پڑے ہوئے انسان کے لیے یہاں ٹھہرنے کا خیال بھی محال کا درجہ رکھتا ہے۔ سیر و تفریح کے خیال یا قیام کی غرض سے یہاں رہوں یہ دل و دماغ کہاں۔ بعض دواؤں کی فراہمی جن کی اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اسی طرح جاڑے کی آمد کا خیال کرتے ہوئے بعض ضروری کپڑوں کی خریداری کے پیشِ نظر میں یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ پانچ دن سرائے نیرنگ آباد میں کہ جسے عام لوگ ''نورنگ آباد کی سرائے'' کہتے ہیں بے حاصل گزر گئے۔

اس کے بعد ایک مکان اسی محلّے میں اور اسی سرائے کے عقب میں ملا جو بخیل کی گور سے بھی زیادہ تنگ و تار ہے۔ بہرحال وہاں بستر کھول دیا اور اس کے ایک کنارے لیٹ گیا، آرام کیا، اگرچہ دواؤں کو جوش دینا اور دوسرے اسی سلسلے کے کام حالتِ سفر میں آوارگی کی چادر میں پیوند پر پیوند لگانے جیسی بات ہے اور یہ کام فرصت کا تقاضہ کرتا ہے، کم از کم چہار ہفتے یہاں قیام رہے گا اور جو ایک ہفتہ غفلت میں بسر ہو گیا وہ بھی اسی میں شمار ہو گا۔

ابھی تک میں دشت و دریا کے مسئلے میں پریشان ہوں کہ آخر کیا کروں۔ کبھی دل میں یہ بات آتی ہے کہ خشکی کے راستے سے عظیم آباد جاؤں اور وہاں سے کشتی

کرائے پر لوں اور کبھی دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ یہیں سے کیوں نہ دریا کا سفر اختیار کر لیا جائے۔

اب میں جناب والا سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ہم ایسے دشتِ بلا کے آوارہ گردوں کی غم خواری کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک نوازش نامہ بغیر تاخیر کے انگریزی ڈاک میں روانہ فرمادیں گے جس سے مزاجِ اقدس کے حالات تفصیل کے ساتھ معلوم ہو جائیں اور عام روش کے برخلاف جس میں خیر و عافیت برائے نام مرقوم ہوتی ہے آغازِ صحیفہ ہی میں اس کو تفصیل سے تحریر فرمادیا جائے اس لیے کہ (عالم الغیب وشہادۃ) یعنی اللہ پاک اس بات کو جانتا ہے کہ میرا دل بسا اوقات حضرت والا کے بارے میں سوچ میں مبتلا رہتا ہے کہ مزاج عالی کیسے ہوں گے۔

انشاء اللہ وہ عریضہ جو کہ آپ کی طرف سے آنے والے گرامی نامے کے جواب میں تحریر ہوگا اس میں روانگی کا دن، تاریخ اور یہ کہ میں خشکی کے راستے سے جارہا ہوں یا دریا کی راہ سے سفر اختیار کر رہا ہوں، اس سے متعلق وضاحت ہوگی۔ اگرچہ میں نامۂ گرامی کے بارے میں اصرار کے ساتھ استدعا کر رہا ہوں اور بیش از بیش اس پر زور دینا چاہتا ہوں لیکن میرا دل اس گمنامی کی شرم اور اس بے کسی پر ہزار گنا تکلیف محسوس کر رہا ہے اور اس آدمی کے دل کی طرح ہے جس کا دل ایک ہی لمحے میں بیشمار نشتروں اور خنجروں سے زخمی کر دیا جائے، یہ شرمِ نارسائی ہے۔

جہاں میں ٹھہرا ہوں وہ ایک بوڑھی عورت کا مکان ہے کہ وہ خود بھی اتنی مفلس ہے کہ اس کے چراغ میں اکثر تیل نہیں ہوتا۔ اور اس کے اس تاریک مکان میں شاید ہی کبھی مرمت اور سفیدی یا پنڈول وغیرہ کرایا گیا ہو۔ اس کی مثال اس ''قریۂ

ویران‘‘ کی سی ہے جس کے لوگوں نے خراج دینے کے خوف سے اس کا حال خود ہی تباہ کرلیا ہو۔ نہ یہاں کوئی نامی بازار ہے اور نہ کوئی شاندار حویلی ہے کہ جس کے پڑوس کی وجہ سے نام ونشان تلاش کیا جا سکے اور دوسرے اسے جانتے ہوں۔

کوئی نامہ بر چاہے وہ پیکِ خیال ہی کیوں نہ ہو آخر کس پتے کس نشان سے یہاں پہنچے۔ میرے مخدوم (یعنی آپ) جب مکتوب روانہ فرمائیں تو اسے سپردِ خدا فرمادیں یہ پتہ لکھ دیں۔ سرائے نورنگ آباد قریب مکان گھوسی خانساماں مٹھائی کی حویلی میں جو رمضان کے مکان کے قریب ہے اسداللہ خان غریب الوطن کو پہنچ جائے (کہ اس شہر میں تازہ وارد ہیں)۔ شاید کہ ’’محکمۂ ڈاک‘‘ کے لوگ ایک ایسی دعا کے تیر کی طرح جو مقبول ہوتی ہے اسے بھی نشانے تک پہنچادیں اور کوئی غلطی نہ کریں اس ہرزہ سرائی اور پریشان گوئی کے لیے ’میں آپ سے‘ ہزار بار معافی چاہتا ہوں۔

اگر اس معاملے میں کوئی بات دوبارہ چھیڑی جائے تو وہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہوگا اور اس رومال سے زیادہ لمبا دفتر اس کے لیے درکار ہوگا اس لیے میں اس فکرِ فضول سے باز رہنا چاہتا ہوں جس کے بعد ہزار بار معذرت کرنی پڑے۔

پیشانیِ عفوِ ترا پر چین نہ سازد جرم ما
آئنہ کے غم خورد از زشتی تمثالہا

ہمارا جرم تیری معاف کردینے والی پیشانی پر کوئی شکن نہیں پیدا کرے گا۔ آئینہ دیکھنے والے کی بدصورتی کی وجہ سے کبھی اظہار ناخوشی نہیں کرتا۔

عمر و دولت ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں۔ اور حیاتِ ابدی کے عشرت کدے میں وہ کبھی آپ سے جدا نہ ہوں۔ حضرت شاہ محمد ذکری صاحب کی خدمت میں نیز

خاں صاحب اور مرزا کی بارگاہ میں اس نیاز مند کی نیت و خواہش اور آرزومندیاں خدا کرے کہ شرف قبول پائیں۔

(اسداللہ)

مربی بے کساں سلامت

کورنش و تسلیم کی بجا آوری کے بعد عرض خدمت یہ ہے کہ اس کام کے لیے کسی آدمی کا بہم نہ پہنچنا غالب کی بیکسی کے تقاضوں میں سے ہے، میرے مخدوم و مطاع اس کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔

فی الجملہ وہ متاع عزیز کہ خاص غالب کے لیے ہوگی، وہ کسی اور کے لائق تو نہ ہوگی، میں اس باب میں گشتی اور اہلِ کشتی سے خوش ہوں اور رہزنوں کی طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ باربردار صاحب کی جانب سے البتہ مجھے تشویش ہے اس لیے کہ نواب صاحب والا القاب حالت سفر میں ہیں اور سمتِ سفر بھی ایک نہیں، اب ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے پیش نظر مدد و معاونت کا دارومدار باربردار پر ہوگا۔ ان کو ہموار کرنا قسمت کے ستاروں کو اپنے حق میں کرنے کے مترادف ہے۔

امید یہ کہ میرے خواجہ تاشوں یعنی حضرت والا کے ملازمان بارگاہ میں سے کوئی شخص ''کوتوالی چبوترہ'' پہنچ کر اسے کوتوال شہر کے سپرد کر دے۔ یہ شحنۂ شہر مجھ سے تو نا آشنا ہے لیکن حضرت والا کے نام نامی سے ضرور واقف ہوگا۔ اگر بنارس تک اس کا پہنچنا ممکن ہو تو زیادہ اچھا ہے ورنہ الٰہ آباد اسے پہنچا دیا جائے۔

میں خود اپنے دل سے استخارہ کر رہا ہوں کہ کیا یہ زیادہ بہتر نہ ہوگا کہ کل، صبح سویرے، راہِ سفر اختیار کی جائے۔ مشہور ہے کہ پنج شنبہ کا دن سفر کے لیے مبارک ہوتا ہے ورنہ کل اپنے سامان میں سے کچھ سامان (آپ کے) در دولت پر چھوڑ کر اور جمعہ کی صبح کو شرفِ قدمبوسی حاصل کر کے رہ گزیں سفر ہو جاؤں گا جو مکاتبات 'کل یا آج'

تحریر فرمائے جائیں گے ان کے بارہ میں التماس کو دہرانا فضول ہے تاریخ بدایونی اور ''رسالۂ تصوف'' پہنچ رہا ہے۔

اظہارِ عجز و نیاز کے ماسوا اور کیا عرض کروں۔ اسے ڈاک کدہ پہنچا دیا جائے اور محصول کی ادئیگی کے بعد رسید لے لی جائے۔ متوقع ہوں کہ رات تک غالب کا جذبہ و شوق اسے پاے بوسِ حضرت والا تک پہنچادے گا۔ زیادہ تسلیم۔

(اسد اللہ)

.....

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

چونکہ ادائے آداب و کورنش کے مضامین اور تسلیم و تصدق کی رسمیں نامہ نگارانِ روزگار کی ''دست فرسودہ'' ہیں، اب میرا دلِ پُر شوق اس اندازِ خدمت گزاری سے خوش نہیں ہوتا۔ لاجرم میں سرِ مبارک کے گرد طواف کرتا ہوں، اور (آپ کے) قدموں کی خاک پر گوہر جاں نثار کرتا ہوں۔

باقی سر رشتہ کار، آسمان اور ستاروں کے پیدا کرنے والے کے ہاتھ میں ہے، اور زمامِ اختیار عبودیت کی رہ نوردی میں گم ہے۔ جنوری کی چار تاریخ کو کہ دوشنبہ کا دن تھا، حاکم دہلی کا مکتوبِ مُرزبانِ فیروز پور کے نام روانہ کیا گیا چونکہ مکتوب الیہ اسی دیار میں موجود تھا، خط کے پہنچنے میں دیر نہ لگی، للہ الحمد کہ صورتِ حال کچھ واضح ہوئی۔ داورِ دہلی کے فرمان کا خلاصۂ نگارش یہ ہے:

''چونکہ محمد اسد اللہ خاں کے دعوے سے متعلق مقدمہ کی تحقیقات کے لیے صدر عالی قدر کی طرف سے حکم نامہ صادر ہوا ہے خانِ مذکور (غالب) کی عرضی کی نقل

تحریر ہذا کے ساتھ حوالۂ قلمِ محبت رقم کی جاتی ہے کہ عبارت سے آگاہ ہو کر بہ تشریح اس کا جواب جلد از جلد ارسال کریں۔''

دیگر یہ کہ اگر کوئی امر مانع ہوا تو یک شنبہ یا دوشنبہ روز رحیل ہوگا۔ درنگ بہر حال میں نہیں چاہتا، آج کہ آدینہ روز ہے میرے اسباب سفر کا ایک حصہ کشتی میں پہنچ گیا۔ اور بس۔

نواب علی اکبر خاں نے والا نامہ کا جواب دے دیا ہے لیکن اس کا سرنامہ حرف سادہ سے زیادہ نہیں۔ موصوف کا خیال تھا کہ ان کا کرم نامہ کسی دوسرے خط کے ساتھ ''ہم نورد'' ہوگا اس لیے سادگی عنوان میں کوئی قباحت موصوف نے محسوس نہ کی۔ یہ جز و مکتوب گویا باقی ہے۔

دو ماہ کے عرصہ میں باندا پہنچ جاؤں گا اور حضرت والا کے مبارک قدموں پر گوہر جاں نچھاور کروں گا۔ اگر اس اثنا میں کوئی گرامی نامہ ارسال فرمایا جا چکا ہوگا یا پھر اس عریضہ کی خدمت بندگان عالی میں رسائی سے پیشتر روانہ کیا جائے گا۔ ڈاک کے قاعدہ کے مطابق وہ پھر واپس ہو کر نظر گاہ والا تک پہنچ جائے گا۔ اور اس عرضداشت کے ورود کے بعد خود ملازماں بارگاہِ عزیمت نگارش و تحریر سے دست کش ہو جائیں گے۔

من بعد، میرے غیاب میں اگر دہلی یا کلکتہ سے کوئی مکتوب آئے، وہ براہِ راست میرے نام ہو یا آپ کے توسط سے اُسے مجھ تک پہنچانا مقصود ہو، اس کو ملاحظہ فرما کر محفوظ رکھا جائے کہ اس بے قرار نے اپنے طور پر یہی قرار دیا ہے۔ یہ بات حضرت والا سے پوشیدہ نہ رہے کہ دہلی سے آنے والا مکتوب مخدومی و مکرمی مولوی فضل

حق خیر آبادی کا ہوگا۔ اور کلکتہ سے پہنچنے والا خط میرے محترم دوست مولوی سراج الدین احمد کا جو مولوی عبدالکریم کے بھتیجے ہیں اور فارسی دفتر خانہ کے اعیان میں شامل ہیں۔

میں نے ان سے یہ درخواست کی ہے کہ میرے معاملہ میں جو بھی نئی صورت حال ہو مجھے اس سے مطلع کیا جائے۔ خط چاہے مجھے لکھا جائے یا میرے مخدوم مولوی محمد علی خاں صاحبِ صدر امین باندا کو بہر دو صورت بھیج دیا جائے۔

ابھی کہ ریزی ڈینسی سے اجرائے حکم کا وقت نہیں آیا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ فرماں روائے دہلی کو اس قضیہ یا معارضہ میں کسی فریق کی سوگری یا کسی کے حق دوستی سے کوئی تعلق نہیں اور مدعا علیہ کے ساتھ کسی ترجیحی سلوک کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ یہ والیِ بلندرتبہ کسی سے اپنائیت و بیگانگی کا کوئی رشتہ نہیں رکھتا اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اہل دفتر میں سے کوئی میرا روشناس بھی نہیں ہے۔

جہاں تک کے سربراہ کے دفتر خانے کے بنارس پہنچنے اور وہاں سے پایۂ تخت کو لوٹ جانے اور دہلی کی طرف سفر کو اگلے سال پر ملتوی کرنے کا سوال ہے یہ داور کلاں (گورنر جنرل اِن کاؤنسل،) میرا روشناس ضرور ہے مگر اس کی آمد و شد اور پروگرام کے التوا کے بارہ میں مجھ ایسا کوئی آدمی کیا کہہ سکتا ہے۔

اب حضرت ولی نعمت کا نامۂ کرم اُدھر سے نہیں آرہا ہے۔ اس کی طرف سے میرا اندوہِ انتظار حد سے گزر گیا ہے امید کہ دو تین روز میں مجھے حضرت والا کی جانب سے پروانۂ بحالی مل جائے گا اور میں اس کشمکش سے نجات پا جاؤں گا۔

جو قصیدہ کہ اس عاجز کی رگ کلک سے، ناظم الملک مسٹر فرانس ہاکنس بہادر

ہیبت جنگ کی مدح میں تراوش پا کر زیب قرطاس ہوا ہے اسے یہاں رقم کیا جاتا ہے۔

(اسد اللہ)

....

مُربی بے کساں سلامت

تسلیمات کے بعد معروضِ خدمت یہ ہے کہ کسی آدمی کا بہم نہ پہنچنا غالبؔ کی بے کسی اور بے بسی میں سے ہے۔ میرے مخدوم اس معاملے میں تردّد نہ فرمائیں۔ جو متاع کہ میرے اسباب میں شامل ہے وہ کسی چور کے لائق ہی نہیں۔ جو اُسے چوری کرنے کی فکر کرے۔ اس معاملے میں نہ مجھے کشتی کے ہم نشینوں کی طرف سے کوئی خطرہ ہے اور نہ رہزنوں کا کوئی اندیشہ۔ میری تمام تر تشویش بار بردار کی جانب سے ہے، اس لیے کہ نواب صاحب والا صفات خود بھی سفر میں ہیں۔ بدرجۂ مجبوری اس موقع پر بار بردار کی معاونت یا اس کی عارضی مدد کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

مجھے امید ہے کہ میرے خواجہ تاشوں میں سے، جو آپ کی بارگاہِ عالی کے خادموں میں سے کوئی شخص ہوگا، چبوترے کی کوتوالی پہنچ کر شہر کے حولدار کو جو مجھ سے نا آشنا ہے جناب والا کی طرف سے کلمۂ خیر پہنچا دے۔ اگر بنارس تک بات ہو جائے تو بہت اچھا ہے ورنہ الہ آباد تک آپ کی طرف سے حکم نامے کے کلمات پہنچ جانے چاہئیں۔

میں اپنے طور پر الجھ رہا ہوں کہ آخر کیا ہو کل صبح راہِ سفر اختیار کرلوں اس لیے کہ مشہور ہے کہ پنج شنبہ کے دن سفر مبارک ہوتا ہے۔ ورنہ کل سامان کا کچھ حصّہ دولت خانۂ والا تک بھیج دیا جائے گا۔ جمعہ کی صبح کو شرفِ قدم بوسی حاصل کر کے میں سفر پر

روانہ ہو جاؤں گا۔ جو مکاتبات کہ آج عنایت ہوں گے، اب اُن کے لیے التماس غیر ضروری ہے۔ بدایونی کی تاریخ اور ''رسالۂ تصوف'' پہنچ رہا ہے سلامِ نیاز مندانہ پیش کرنے کے علاوہ اور کیا عرض کروں۔

محمد اسد اللہ

(قبلہ ام)

دو تین روز گزر گئے کہ ایک مکتوب اس خاکسار کے غربت کدہ سے آیا ہے، اس کے نقش و نگار کا انداز حالات کی رُخ نمائی کر رہا ہے۔ میں نے اس صورت حال کے بارے میں کچھ باتوں کو لکھ بھی دیا ہے اور اس دادگاہ کی خبروں سے متعلق بعض امور کو وضاحت کے خیال سے مزید سپرد قلم کر دیا ہے اور ان نگارشات کو حضرت والا کی نظر گاہ تک پہنچا دیا ہے۔ اُمید کہ یہ تحریریں نظر کیمیا اثر سے گزر چکی ہوں گی۔

آج کہ دوشنبہ کا روز ہے اور ماہِ رجب کا پہلا دِن، کل اپنے اس دوست کا خط مجھے ملا کہ جس کے بارہ میں اپنے پچھلے مکتوب میں آپ سے میں نے کچھ باتیں کی تھیں۔ اس خط میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ میری بھیجی ہوئی عرض داشت پہنچ گئی ہے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا یہ دوست میرے کام سے غافل نہ تھا۔

میری چارہ جوئی کے معاملہ میں اس نے بے توجہی نہیں برتی سچ یہ ہے کہ وہ مجھ پر خود سے زیادہ مہربان ہے اور دادخواہی کے آداب کو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ کہ اس نے آج تک اس معاملہ کی خبر نہ دی تھی یہ بھی یک دلی و ہمدردی کی بنا پر تھا، دوری و تغافل کے باعث نہیں۔

یہاں تک اس کا خط اس کی گراں مایگی کا آئینہ دار ہے اور میں آئندہ کے

لیے یہ امید کرتا ہوں کہ غالب خستہ کو جویاے خیر سمجھ کر اب ایسا نہیں ہوگا کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ کیا ماہ دو ماہ تک مجھے یاد ہی نہ کرے۔

مزید مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے جو خط آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے اس پر تین دن سے زیادہ نہیں گزرے اور اس عرصۂ سہ روزہ میں کہ یہ خط پہنچا ہے کوئی ایسی نئی بات سامنے نہیں آئی جو لائق ذکر ہو۔ جو باتیں قابل تحریر تھیں وہ میں نے اپنے مکتوبِ سابق میں لکھ دی تھیں اب اس داستان کو طول دینا فضول ہے زیادہ حد ادب۔ محمد اسد اللہ

قبلہ و کعبۂ راستاں

ایزد پاک آپ کے سایۂ عاطفت کو ہم نیاز مندوں کے حق میں قایم و دایم رکھے۔

ایک زمانہ ہو گیا کہ اس آستانِ ارادت سے دوری کے سبب، میری سانسیں شرر بار ہیں اور جبینِ خیال، اس بارگاہ کی خاک بوسی کے شوق میں سجدہ ریز۔ افسوس کہ میرے اور اس عقیدتوں کے آستانے کے مابین، جس کے پانی کے چھینٹوں سے، آتشِ فراق کو فرو کیا جا سکتا ہے، سات سمندر حایل ہیں۔

اور اس سنگِ در سے جسے سجدہ عقیدت کے لیے ''مہر نماز'' کہا جا سکتا ہے، اتنی دوریاں موجود ہیں جنہیں قطبین کے فاصلوں سے کم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عطوفت نامہ نے، بنارس کی خاک نشینی کے زمانہ میں میری چشم بخت کو نور اور بخت چشم کو سرور بخشا تھا۔ اس تحریرِ سعادت کے جواب کو۔ منجملہ مغتنمات تصور کر کے خدمت والا میں ورق بندگی روانہ کیا اور خشکی کے راستہ سے عظیم آباد کا سفر اختیار کیا۔

فی الجملہ توجہِ عالی کی بدولت، کہ سرچشمۂ فیوض و برکات ہے، گردِ راہ کی طرح کوہ و بیابان میں افتان وخیزاں سفر کرتے اور خار خارِ مصائب کے باعث سینہ کے بل دم تیغ سے گزرتے ہوئے کبھی شدتِ سرما کے اثر سے یخ بستہ راتوں کے لمحات میں افسردہ خاطر اور کبھی گردشِ ایام کی چیرہ دستیوں سے نالاں، بروز چہارشنبہ، رمضان المبارک کی چوتھی تاریخ کو پہر دن چڑھے، کلکتہ پہنچ گیا۔

میں خدائے بزرگ و برتر کی ان غریب نوازیوں پر ناز کرتا ہوں کہ ایسے مقام میں (جہاں میں اجنبیِ محض ہوں) ایک ایسا گھر، جس میں ہر طرح کی راحتیں موجود ہیں، بغیر کسی محنت و کاوش اور کسی دوسرے شخص کی منت پذیری کے کچھ روپیہ ماہوار کرایہ پر مل گیا۔

اس میں آزاد طبع لوگوں کی خاطرِ کشادہ جیسی راحت بخش فضا ہے اور حریصوں کے فراخ دہانوں جیسا، کھلا ہوا بیت الخلا، صحن کے ایک گوشہ میں ایک کنواں ہے جو آبِ شیریں سے پر ہے اور اس کی بالائی منزل میں 'ایک کمرہ' جو صاحبِ ثروت لوگوں کے لیے آرام گاہ کے طور پر کام آسکے۔ میں نے اسے اپنی تکیہ گاہ بنالیا۔

دو دِن رات میں نے اس راحت کدے میں آرام کیا اور ایک طویل راہِ سفر کی تھکن سے نجات پائی۔ بعد ازاں آپ کے ''نامۂ مبارک'' کو مشعل ہدایت بنایا اور اپنی منزلِ مراد کی طرف قدم بڑھایا۔ کشتی میں بیٹھ کر ہگلی کی طرف روانہ ہوا۔

پہلے میں نے اسی مقدس ایوان کی طرف رخ کیا (جہاں حضرت امام حسین کی 'جو صاحبِ ثنا و ستایش ہیں ''ضریح مبارک'' رکھی ہوئی ہے) اس مقامِ متبرک کی زیارت کی۔

جب حضرت کی بساطِ قرب یعنی خدمتِ اقدس تک پہنچا تو فرطِ عنایت سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ تمہارے انتظار میں تو کئی روز گزر گئے۔ جب میں نے کیفیت انتظار کے بارے میں معلوم کیا تو۔ اس امر سے مطلع ہوا کہ جناب والا نے میرے تعارف نامہ کے طور پر نواب صاحب کو خط تحریر فرمایا اور براہِ راست ملاقات سے پیشتر، مجھے نواب صاحب موصوف سے (معنوی طور پر) ملایا اور غائبانہ روشناس کرادیا۔

میں دو تین ساعت نوابِ عالی جناب کی خدمتِ اقدس میں، ٹھیرا پھر اجازت طلب کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے غم کدے کی طرف واپس آ گیا دو روز کے بعد پھر نواب صاحب کی بارگاہ میں باریاب ہوا تو دو روز اور ایک شب صحبت رہی اور پرسشِ مزاج کی صورت درمیاں میں آئی۔

مقدمہ کا حال میں نے بہ تفصیل بیان کیا۔ حضرت نے اس طرح دلدہی نہ فرمائی کہ میں اس پر خوشی کا اظہار کرسکوں۔ اور نا اُمید بھی نہیں فرمایا کہ میں اس کا خیال ہی ترک کردوں:

جہاں بے مہر و گیتی دشمن و دلدار مُستغنیٰ
مرا بر آرزوہائے سنائی خندہ می آید

دنیا اس کے تیئں بے مہر و بے محبت ہوگئی۔ سارا عالم اس کی دشمنی پر آمادہ ہے اور اس کا محبوب بے نیاز ہے اس حالت میں مجھے تو سنائی کی آرزوؤں پر ہنسی آتی ہے۔

میری قسمت کی نارسائی اور آشفتگی پر نظر فرمائیے کہ آج کل نواب صاحب کو ان زمنیات کے بارہ میں، جو امام باڑہ ہگلی سے متعلق ہیں، ہگلی کے کلکٹر کے ساتھ

معارضہ (مقدمہ) درپیش ہے جسے نزاع کہنا چاہیے اوران کا دل اپنے اس معاملہ میں الجھا ہے یہ باتیں نہ صرف یہ کہ نواب صاحب کی بات چیت کے دوران سامنے آئیں بلکہ خارج سے بھی اس بارے میں بہت کچھ سننے میں آیا۔

ہمہ را ماتمیٔ حسرتِ دنیا دیدم
چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

جب میں آتش پرستوں اور مسلمانوں کی عشرت گاہوں میں گیا تو سب کو دولت دنیا کے ماتم میں مبتلا دیکھا۔

نواب احمد بخش خاں (مرحوم) کے واقعۂ وفات کی خبر حضرت والا کے گوش اقدس تک پہنچ چکی ہوگی۔ نواب صاحب کے مادی وجود کا معدوم ہو جانا اگر میرے اس مقدمہ کو، فائدہ نہیں پہنچاتا تو نقصان کی بھی اس سے کوئی صورت مقصود نہیں لیکن میں اس صورت حال کے بارے میں سوچ کر بے خود ہوا جارہا ہوں، ایک یہ کہ مجھے مستقبل کے بارہ میں جو خطرا تھا وہ ابھی سامنے آگیا یعنی اپنے بھائیوں کے سامنے گدائی کے واسطے ہاتھ پھیلانا پڑے۔

دوسرے یہ کہ جو مسرّت مجھے یہ مقدمہ نواب صاحب سے جیت کر ہوتی اب اس کا موقعہ ہی نہ آئے گا۔ یعنی کسی غاصبِ قوی سے انتقام لینا اور اپنے ہم چشموں کی انجمن میں پھراس پرفخر و مسرّت کا اظہار کرنا۔

(اسداللہ)

خطا بخش وعیب پوش من سلامت باشند

جناب کے اس بندۂ نوخرید کو ادائے سخن میں دو لغزشیں پیش آئیں۔ ایک یہ کہ میں نے بنارس سے جو غزل بھیجی تھی اور جس کا مطلع یہ ہے:

اے بصدمۂ آہے بر دلت زما بارے

ایں قدر گراں نہ بود، نالۂ ز بیمارے

اے کہ ہماری آہ سے تیرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے اور تو اسے اپنے دل کے تئیں ایک بھاری بوجھ تصور کرتا ہے کسی بیمار کے نالۂ ناتواں کو اتنا بھی تکلیف دہ تصور نہیں کرتے۔

امید ہے کہ جناب والا مطلع مذکور کے سرے کو محو فرما کر اس مطلع کو اس کا ''نعم البدل'' خیال فرمائیں گے اور ان دو مصرعوں کی جگہ اس مطلع کو دیدیں گے۔

دوسرے یہ کہ یہ قصیدہ میں نے آغا میر کے لیے لکھا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ میرے خاندان اور اس کے وقار کے تئیں ''عجب داغِ بدنامی'' ہے اور لطف یہ کہ ایک سو دو شعروں کو صفحۂ خاطر سے محو بھی نہیں کیا جا سکتا چونکہ نواب مرشد آباد بھی سید زادہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس قصیدہ کو اس نئے ممدوح کے نام سے شہرت دوں اگر چہ میں ہنوز اس کی خدمت میں نہیں پہنچا۔ لیکن نواب ہمایوں جاہ کا مدح نگار ہونا میرے لیے کوئی ناخوشگوار بات بھی نہیں۔

عرض یہ کہ جب تک قصیدہ کے لیے 'ممدوح' کے نام کی وضاحت نہ ہو جائے اسے کسی کو نہ دکھلائیں اور خردوں کے عیب کو بڑوں کی طرح چھپائیں عنایت نامہ تحریر فرمائیں تو اس کا پتہ اس طور پر لکھیں۔ شہر کلکتہ قریب چیت بازار، شمالہ بازار نزد تالاب، اسد اللہ خاں کے مطالعہ میں آئے۔ آرزوے قدم بوسی کے ماسوا اور کیا عرض کروں۔

محمد اسد اللہ

قبلہ وہ قبلہ گاہ من سلامت

آداب وکورنش وتسلیم سے وابستہ رسمی تکلفات کو، میرا مزاجِ بندگی اخلاص و یگانگت کے رشتوں کے تئیں..... توجہ کے لائق خیال نہیں کرتا۔ خوردانہ وفرزندانہ نیاز بجالاتا ہوں۔ اور عرض پرداز ہوں کہ عنایت نامہ نے اپنے ورود سے سرفرازی بخشی۔ ارشادِ والا کے بموجب حضرت قاضی القضاۃ کے مزار فائزالانوار پر حاضر ہوا اُمید کہ نیاز نامہ کے ملاحظہ کے بعد میر کرم علی صاحب کا اسم گرامی ''نظر کیمیا'' اثر سے چھپا نہ رہا ہوگا۔ میری طرف سے مکتوب کی نگارش میں تاخیر کا باعث تساہل ولاپرواہی نہیں تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی بات لائقِ تحریر ہو تو عریضہ ارسال خدمت کروں۔ ذوقِ قدم بوسی میرے لیے تحریر وبیان کا سرمایہ ہے۔

(محمد اسد اللہ)

میرے قبلہ گاہ

گرامی نامہ کے صادر ہونے کے بعد جناب بیگم صاحبہ قبلہ کی خدمت میں حاضری کے لیے ایک دوست کی رہنمائی میں اٹالی پہنچا اور اپنے مخدوم کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ پہلے میں مزار پر گیا اور فاتحہ پڑھی۔ مجھے اپنی بے کسی پر رونا آیا۔ اپنے عریضہ کو ایک محرم کے وسیلہ سے اندرون خانہ پہنچایا۔ مولوی غلام علی صاحب نامی ایک بزرگ صورت شخص میرے پاس آئے اور اس حقیر کو حرم سرا میں لے جا کر پردے کے پیچھے بٹھا دیا۔

بیگم صاحبہ از راہِ کرم، بنفس نفیس وہاں تشریف فرما ہوئیں۔ پہلے جناب والا کا حال معلوم کیا اور اس نیاز مند کی آوارگی کے بارہ میں پرسش فرمائی۔ اور فرمایا کہ

میرے خواہرزادے مولوی ولایت حسن خاں اس وقت موجود نہیں جیسے ہی وہ آئیں گے انہیں تمہارے پاس پہنچنے کے لیے کہا جائے گا۔

وہ یہاں، تمہارے قیام کے لیے، اس ''عمارت کدہ'' میں، کسی جگہ کا انتخاب کریں گے۔ شملہ بازار جہاں تم ٹھیرے ہوئے ہو وہ حکام کے بنگلوں اور قیام گاہوں سے دور ایک مقام ہے۔ دوبارہ اُن مخدومہ کے در دولت پر حاضر ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میر ولایت حسن ہنوز دورہ سے واپس نہیں آئے۔

ایک معتبر آدمی نے صبح یہ خبر سنائی ہے کہ مولوی ولایت حسن آج کلکتہ پہنچ رہے ہیں۔ ماہ شوال کی چودہ تاریخ ہے اور ہفتۂ رواں کے بھی نصف دِن بیت چکے ہیں یعنی روز سہ شنبہ ہے۔ فقیر کے اِن دنوں کا ایک حصہ ضروری کاغذات کی نقل حاصل کرنے میں خصوصاً اور دفتر سرکاری کو اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں شہادت بہم پہنچانے کے ضمن میں عموماً صرف ہوا۔

حاصل اس تمام سعی وکاوش کا یہ کہ ایک عرضداشت جو اس مقدمہ کی بیس سالہ روداد ہے، نیز میرے معاملہ میں جو زیادتی ہوئی ہے اس کے خلاف اپنی عذرداری کو اور جو فیصلہ ہوا ہے اس کو سلسلہ وار رقم کرایا اور کل کہ ماہِ رواں کی تیرہ تاریخ اور دوشنبہ کا دن تھا، پیش کر دیا۔

تمام سفیر، وکلا اور اہل دربار اسی دن حاضر ہوتے ہیں۔ میں فریزر صاحب کی ملازمت میں باریاب ہوا۔ یہ صاحبانِ عالی شان میں، ایک مقتدر اور صاحبِ منزلت شخص ہیں۔ گورنر جنرل تک رسائی کے لیے ان کی حیثیت ایک ''دروازہ دار'' بلکہ خود ''دروازہ عالی'' کی سی ہے۔

فریزر نامی اس اعلیٰ انگریز افسر کا عہدہ یہ ہے کہ جو بھی داد خواہ بن کر آتا ہے، اور اراکین کونسل یا گورنر جنرل تک رسائی چاہتا ہے وہ اسی افسر کی اجازت اور وسیلہ سے وہاں پہنچ سکتا ہے۔ جس طرح کی عرضیاں بھی نظمائے کونسل کے حضور میں پیش ہوتی ہیں، وہ ان عرض داشتوں کو زبان انگریزی میں ترجمہ کر کے اراکین کونسل کی نظر گاہ تک پہنچاتا ہے۔

یہ فقیر بھی اس عرضی نامہ کے ساتھ جسے گورنر جنرل کی بارگاہ میں، پیش ہونا ہے، اطلاع اجازت کے بعد اس افسر اعلیٰ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ فریزر صاحب نے اٹھ کر میرا استقبال کیا اور گلے ملے۔ میں نے اپنے تعارف احوال میں یہ دریافت کہ آپ نصر اللہ بیگ خاں سے متعارف ہوں گے؟ فرمایا ہاں ہم نصر اللہ بیگ خاں کو جانتے ہیں تم اس کے کون ہو میں نے کہا میں ان کا حقیقی بھتیجا ہوں، بہر حال جو کچھ تقاضائے وقت تھا، میں نے اس کے مطابق بیان کیا، فرمایا کہ نواب گورنر جنرل بہادر کے لیے عرضی لے کر آئے ہو، میں نے اس پرزۂ کاغذ کو اپنی جیب سے نکالا اور پیش کیا، بارے میرا یہ عذر قبول کر لیا گیا کہ میں نے ریزیڈینٹ کی خدمت میں اپنا معاملہ پیش کرنے کے لیے رجوع کیوں نہیں کیا۔ اگر یہ عذر قبول نہ کیا جاتا تو عرضی بھی پیش نہ کی جا سکتی۔

فریزر صاحب ممدوح اس معاملے میں صاحبِ اختیار ہیں کہ جس مقدمے کو کونسل میں پیش کرنے کے لائق تصور نہ کریں اس کے بارے میں عرضی گزارِ مقدمہ کو، خود جواب دے دیں۔ بہر حال یہ پہلا مشکل مرحلہ جس کو ایک خطرناک ٹیلہ کہنا چاہیے اور جہاں پیر پھسلنے کے امکانات زیادہ تھے، خدا کے فضل سے طے ہو گیا اور میری عرضی

منظور ہوگئی۔

فریز رصاحب موصوف نے رخصت کے وقت عطردان و پان دان طلب فرمایا اور اپنے دستِ مبارک سے مجھے عطر و پان عطا کیا اور اپنی نشست سے اٹھ کر رخصت کے وقت مجھ فقیر کا سلام قبول کیا۔ اب میں تقدیر کی نیرنگیوں کا تماشائی ہوں کہ آخر کیا رونما ہوتا ہے۔ علاوہ بریں اس اثنا میں جو صورت پیش آئی اور جو کچھ ہوا اس کے بارے میں بھی ہرگز مجھے یہ خیال نہ تھا کہ ایسا ہوگا بلکہ ایسا ہوجانے کو میں مردے کے زندہ ہوجانے کے برابر تصوّر کرتا تھا، اللہ کا کرم ہے۔ وہ بڑی قدرت والا ہے کہ تائیدِ غیبی کی بدولت یہ ہوگیا اور میری روح کو مسرّتوں کی خوشبو سے معطّر کیا، درحقیقت اس کا بیان ایک نگارستانِ معانی کا درجہ رکھتا ہے۔

اس الہامی بات کی تشریح اور اس اِجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرا بھائی مرزا یوسف اختلالِ ذہنی کے باعث مستی اور سرشاری کی زندگی گزارتا تھا سراپا برہنہ اور بے لباس اور عریاں ہوکر بھی اسے کسی حالت میں بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ وہ ماں کو ماں نہیں کہتا تھا بھائی کو بھائی کہہ کر نہیں پکارتا تھا اور ''گمشدگی'' کی حالت میں زیست کرتا تھا، رمضان کی ستائیس (۲۷) تاریخ کو مجھے دہلی سے آنے والا ایک خط ملا جب میں نے اس کا سرنامہ کھولا تو معاً میری نظر ایک پرزہ کاغذ پر گئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ میرے بھائی کی تحریر ہے جب میں نے غور سے پڑھا تو دیکھا وہ پرزۂ کاغذ ایک خط ہے کہ میرے بھائی مرزا یوسف نے اسے خود لکھا ہے اور ان القاب وآداب کے ساتھ لکھا ہے جو ہوش مندی کا تقاضہ ہوتا ہے۔ میں خوشی سے اچھل پڑا اور انتہائی مسرت کے عالم میں مجھ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں بے اختیار جوشِ مسرت

کے باعث رونے لگا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

جب مجھے کچھ ہوش آیا اور میں اپنے ''پراگندہ حواس'' کو جمع کر سکا تو میں گھر سے آنے والے خط کو پڑھنے میں مشغول ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ تمہارے جانے کے بعد مرزا یوسف کی شورش و دیوانگی کچھ اور بڑھ گئی اور جیسا کہ ہم سب ڈر رہے تھے روز و شب وہ اپنے شور و فریاد اور مار دھاڑ سے مسلسل ہم لوگوں کو ناخوش رکھتے تھے۔ شاہی محل سے تعلق رکھنے والی ایک ماما کی خدمات حاصل کی گئیں وہ مرزا یوسف کی چارہ گری پر آمادہ ہوئی۔ اس کے جنون کو اس نے جادو کا اثر بتایا اور اس طرح کی باتوں لکا پتہ گایا کہ جادوِ ٹونے سے تعلق رکھتی ہیں۔

چنانچہ اس نے کہا کہ شہر کی چار دیواری سے باہر ایک درخت کی جڑوں کو کھودا جائے اور ایک ایسی جگہ میں کنوئیں کو دریافت کیا جائے، ہم نے اس کے کہنے کے مطابق کیا تو جیسا اس نے نشان دہی کی تھی ایسا ہی پایا۔ مختصر یہ کہ مرزا یوسف کو اس عورت کے معالجے سے پانچ ماہ کی مدت میں بہت کچھ افاقہ ہو گیا۔ وہ کپڑے پہننے اور ''سترِ عورت'' کو چھپانے لگے۔ پیشاب، پاخانے کے بارے میں بھی احتیاط برتنے لگے۔ انہوں نے دستر خوان پر سب کے ساتھ کھانا کھانا شروع کر دیا اور بیٹی کو بیٹی، ماں کو ماں اور بیوی کو بیوی ماننے لگے۔ ان میں رشتوں کا یہ احساس جاگ اٹھا۔

گھر کے خط سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی تھی اور مرزا یوسف کا اپنا خط بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتا تھا اور اس کی ہوش مندیوں کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ خدا گواہ میں نے مرزا یوسف کی صحت یابی کو اپنے مردہ باپ کے دوبارہ زندہ ہونے سے بہتر سمجھا۔

امید کہ جنابِ والا بھی مجھ فقیر کی عرض داشت کے مطابق اس کو اپنا بیٹا تصور

کریں گے۔ اس کی صحت یابی کی خبر سے خوش ہوں گے اور اس کے حق میں دعا فرمائیں گے کہ باقی ماندہ تکلیف کا اثر بھی دور ہو جائے۔ ازراہِ کرم میر کرم علی کو بھی اس کیفیت سے آگاہی بخشیں اور مجھ پر یہ عنایتِ مزید فرمائیں۔

گر کسے شکرِ حق فزوں گوید
شکر توفیق شکر چوں گوید

اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ اللہ پاک کا شکر ادا کرے تو بھی حق ادا نہیں ہوتا اس لیے کہ توفیق شکر بھی تو اسی کی عطا کی ہوتی ہے اس کا شکر کیسے ادا ہو۔

اسد اللہ

میرے مخدوم اور قابلِ اطاعت

ماہِ ذی قعدہ کی ۲۹ رتاریخ اور جمعہ کا دن تھا کہ والا نامہ نے شرفِ صدوریت سے نوازا اور میرے سرِ نیاز کو "بالِ ہما" کے سایہ سے سرفراز کیا۔ میں نے سب سے پہلے سر آنکھوں پر رکھا۔ بعد ازاں حضورِ والا کی کشف و کرامت پر ایمان لایا۔

اس اثناء میں بہت سے واقعات یکے بعد دیگرے پیش آئے میرا دل دردِ بیکسی اور ہجومِ تنہائی سے کچھ اس طرح گھبرا گیا ہے اور مکروہاتِ زمانہ نے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس طرح گھیر لیا ہے کہ اب جی یہ چاہتا ہے کہ اچھا برا جو بھی ہے وہ میں اپنے محسن کے سامنے رکھ دوں۔

میری عرضداشت کے جواب میں جو رخنے پڑے ہیں ان کے تصور نے بھی مجھے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا..... کہ بشارت نامہ پہنچا اور میرے دل کی گرہیں کھل گئیں۔ میں نے ملفوف خط کو کھولا اور اس کا مطالعہ کرنے پر، منکشف ہوا، اس سعادت

نامہ کا مقطع، اِس عرض داشت کا مطلع بن گیا ہے۔

چونکہ دل میں بہت سے مقاصد کا ہجوم تھا اور میرے تئیں یہ فیصلہ مشکل۔

مجھے اس بارۂ خاص میں کیا تامّل یا تکلّف ہو سکتا ہے، زحمت کی بات ہی کیا کتابوں کے حصول کے بارہ میں، آپ جیسا تحریر فرمائیں گے اس کے مطابق کیا جائے گا میں ان کتابوں کو بوقتِ مراجعت، اپنے ساتھ لیتا آؤں گا۔ اور وہاں آپ سے نیاز حاصل ہوگا تو انہیں خدمت اقدس میں پیش کر دوں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ کتابوں کو یکایک مجھے دینے میں تامل کریں گے۔

مولوی ولایت حسن خاں ماہ شعبان کے اوائل میں دورہ سے واپس آچکے ہیں اور تادم تحریر اسی بقعۂ زمین میں قیام فرما ہیں انشاء اللہ وہ جناب والا کے مکتوب کو بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچائیں گے اور مندرجہ کلمات دوبارہ گوش گزار کیے جائیں گے۔

نواب صاحب والا مناقب نواب علی اکبر خاں ہگلی میں تشریف رکھتے ہیں میں دو تین بار وہاں حاضر ہو چکا ہوں اور ان والا نژاد کی صحبت سے بہرہ ور ایک بار وہ کلکتہ بھی رونق افروز ہوئے تھے، اور میرے غم کدہ کو بھی انہوں نے اپنے ورود سعادت سے منور فرمایا تھا۔

دہلی سے کلکتہ تک کے سفر میں، حق یہ ہے کہ میں نے کوئی بزرگ صورت و شریف سیرت شخص ان خوبیوں سے آراستہ نہیں دیکھا جن سے نواب صاحب کی ذات والا صفات متصف ہے وہ خود بھی نہایت شستہ و شایستہ انسان ہیں اور دوسرے میں یہ خوبیاں پیدا کرنا اور انہیں سراہنا، جانتے ہیں۔

مولوی محمد علی خاں جیسے وہ پھر بھی نہیں کہ وہ مجھے ایسے ناکارہ اور آوارہ بخت آدمی کے بھی کام آتے ہیں خدا ان کو سلامت رکھے اور ان کا نگہبان و یاور رہو۔ (آمین) عجیب باہمہ و بے ہمہ شخصیت ہیں۔

اللہ پاک کا یہ بڑا اکرم اور طرفہ عنایت ہے کہ کلکتہ کی آب و ہوا مجھے موافق آگئی کہ کیا لکھا جائے اور کیا نہیں لہٰذا رسمی تکلفات سے قطع نظر کرتے ہوئے جس سے مراد القاب و آداب سے دست کشی ہے، جو پوچھا گیا ہے (یا نہیں پوچھا گیا اس سے کوئی غرض نہیں) جو باتیں بھی یاد آتی جا رہی ہیں انہیں حوالہ قلم کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے میں، جنابۂ عالیہ بیگم صاحبہ اور مولوی ولایت حسن صاحب کی خدمت میں اپنا سلام پہنچانا چاہتا ہوں۔

رمضان کی ۲۰ رتاریخ اور دوپہر کا وقت تھا کہ میں جناب والا کا پہلا خط لے کر ایک دوست کی رہنمائی میں وہاں پہنچا۔ فاتحہ خوانی کے بعد میں اس عمارت کی ایک نشست گاہ میں بیٹھ گیا اس درگاہ کے بعض ملازم، اس نشیمن کدہ میں آگئے اور پرسش احوال کی۔

ہر چند میں نے کہا کہ میں تو اجنبی آدمی ہوں اور مولوی محمد علی خاں صاحب سے میری نیازمندی کا رشتہ حال ہی میں قایم ہوا ہے انہوں نے میری بات کو نہ مانا اور مجھے مولانا موصوف کے اقربا اور عزیزوں میں شمار کیا اور یہ گمان کیا کہ میں بھی کوئی ان سے خصوصیت اور رشتہ داری رکھنے والا انسان ہوں۔

اتنے میں مولوی غلام علی نام، بیگم صاحبہ کے ایک بھتیجے اندرون خانہ سے وہاں آئے۔ جو کچھ انہوں نے کہا ان میں سے ایک بات کتابوں کے بارہ میں تھی جن

کے ارسال کرنے میں یہ تردد تھا کہ کوئی موزوں اور معتبر آدمی ایسا نہیں تھا کہ وہ کتابیں جس کی معرفت بھیجی جاسکیں جس طرح ہم چاہتے تھے ایسا کوئی آدمی مل نہیں رہا تھا۔

بندہ نے اس کے جواب میں جو بھی عرض کیا وہ بعض لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ قریب قریب وہی بات ہے جو حضرتِ والا کے مکتوب میں درج ہے اور جس نے جناب معلّٰی القاب کے قلم صدق رقم سے تراوش پائی ہے۔اور میں اس کا سپاس گزار ہوں۔

گرمی کی شدّت کے ایّام میں ناریل کا تازہ پانی قند اور مصری کے اضافہ کے ساتھ میری صحت کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا لیکن اب کہ برسات کا موسم ہے میں نے اس کو ترک کردیا ہے، مختصر یہ کہ مجھے جسمانی عارضوں کی اب کوئی شکایت نہیں۔ بلکہ اس شہر میں دہلی کے برعکس مجھے زیادہ راحت وآسودگی میسّر ہے۔

افضل بیگ نامی ایک شخص جو میرے ہم صحبت وہم مجلس افراد میں شامل تھا، اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کی طرف سے وکیل شاہی کے طور پر یہاں آیا ہے منشی عبدالکریم کا دوست اور یار آشنا ہے بلکہ آج کل انہیں کے ساتھ مقیم ہے۔

افضل بیگ خواجہ حاجی کی بیوی کا بھائی ہے یہ خواجہ حاجی وہ شخص ہے جسے نوّاب احمد بخش خاں نے خوامخواہ میرا اچچا بنادیا اور نصر اللہ خاں کے وارث کی حیثیت سے پینشن کی رقومات میں اس کو شامل کرادیا۔حقیقت یہ ہے کہ میرے مقدمہ کے جزو ثانی میں جو ''دادفریاد'' کی شق ہے وہ خواجہ حاجی کی شراکت ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

افضل بیگ پیش بندیوں کے خیال سے میرے ساتھ خفیہ عداوت رکھتا ہے اور مجھے اثنا عشری فرقہ کے لوگوں میں تصوّف والحاد اور زندقہ وکفر سے متہم کرتا ہے اور

اہل تسنن میں فرقۂ اِمامیہ کی بدعقیدگیوں اور رافضیت سے نسبت دیتا ہے۔ میرے کاموں میں طرح طرح کی رخنہ اندازیاں کرتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ میرے لیے وہ رخنہ اندازیاں وجہ نجات ثابت ہوئیں۔

کیا بتلاؤں کہ فریزر صاحب سے ملاقات کے وقت مولوی عبدالکریم نے میرے بارہ میں کیا کیا لطائف پیش کیے۔ میں اپنے آقا و مولا حضرت علی ابن طالب کے اعجاز پر جتنا ناز کروں کم ہے کہ فریزر صاحب دوران ملاقات اور بوقت رخصت میرے ساتھ کس لطفِ کریمانہ سے پیش آئے اور عطائے عطر و پان سے مجھے سرفرازی بخشی۔

میں اس ملاقات سے بہت مطمئن و مسرور رہا۔ اسی ملاقات کے دوران میری عرضی کو نواب گورنر جنرل کی عرض گاہ میں پیش ہونا تھا۔ اس کا معاملہ بھی درمیان میں آیا اور یہاں کے دستور کے مطابق وہ عرض داشت مسٹر ہاتن (صاحب) کے سپرد ہوئی ان کا عہدہ ہی ایسی درخواستوں کی پزیرائی سے متعلق ہے وہ دادخواہوں کی درخواستوں کا زبان فارسی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے انہیں فریزر صاحب کی نظرگاہ میں پیش کرتے ہیں اور فریزر صاحب اصل و نقل کا مقابلہ کر کے پھر انہیں اراکین کونسل کی خدمت میں روانہ کرتے ہیں۔

چنانچہ میں دوشنبہ کے دن فریزر صاحب سے ملاقات کے لیے گیا، صاحب موصوف نے ادائے تعظیم و پرسش مزاج کے بعد قبل اس سے کہ میں اپنی عرض داشت کے باب میں کوئی بات زبان پر لاؤں، بزبان انگریزی لکھا ہوا ایک کاغذ مجھے دکھلایا اور کہا یہ تمہاری عرضی ہے اُس کے مقابلہ سے ہم نے ابھی فراغت پائی ہے، اب یہ

صاحبان کونسل کی نظر گاہ میں پہنچے گی۔

خاطر جمع رکھو کہ تمہارا حق سرکار پر ثابت ہے اور اہالیان سرکار تمہاری حق رسی کے باب میں کوئی ''پس و پیش'' نہیں رکھتے۔

یہ امر ''خاطرِ والا'' سے پوشیدہ نہ رہے کہ اس نوع کی عرضیوں کے گزرنے کے واسطے ہفتہ میں دو دِن مقرر ہیں۔ جمعرات اور جمعہ، آج جمعہ کا دن ہے شاید میری عرضی صاحبان کونسل کے حضور میں پہنچ چکی ہوگی دوشنبہ کے روز ملاقات کے وقت اس کا پتہ چل جائے گا۔ مسٹر اسٹرلنگ نام۔ افسرانِ قوم انگریز میں سے ایک افسر ہے جو کونسل کے دائرۂ عروجی کے لیے نقطۂ آغاز اور قوس نزولی کے لیے نقطۂ آخر ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ صاحب علم و آگہی شخص ہے سخن فہم ہے اور معنیٔ سخن تک رسائی کا سلیقہ رکھتا ہے میں نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جو پچاس اور پانچ پچپن اشعار پر مشتمل ہے اور قصیدہ کے آخر میں اپنے بارہ میں بھی۔ کچھ لکھا ہے۔

اب اسے حسن اتفاق خیال کیجئے کہ کسی شخص کی سعی و سفارش کے بغیر میری رسائی اس انگریز افسر کی خدمت میں ہوگئی اور بہت ہی شایستہ انداز سے ملاقات کا یہ موقع میسر آیا۔ اس نے اپنے لطفِ کریمانہ سے مری خاکساریوں کے درجۂ اعتبار کو بڑھا دیا اور کامیابی کی توقع کو ''نمود'' بخشی۔

میں نے قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کیا اور اس کا ایک حصہ پڑھ کر بھی سنایا۔

اس نے میری بہت دل جوئی کی۔ مجھ سے وعدہ کیا۔ اور میرے کاغذات مقدمہ کی طرف توجہ فرما ہوا میرے اپنے خیال کے بموجب وہ میرا ہمدرد ہے اور

میرے بارہ میں اچھے خیالات رکھتا ہے۔

ہنوز اس سے دوسری بار ملاقات نہ ہوسکی، کل دوشنبہ ہے، اگر اس نے باریابی کی اجازت دے دی تو فبہا ورنہ عید کے موقعہ پر تو ضرور ملاقات ہوگی۔

مخفی نہ رہے کہ یہ اُن انگریز افسران میں سے ہے جو فریزر صاحب کے عملہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے پیش کار و پیش دست قرار دئے جاسکتے ہیں۔ جب کاؤنسل کی پیشی کی غرض سے دو تین مقدمے اکٹھے ہوجاتے ہیں یادادخواہ پیش کرتے ہیں۔ وہ ان دعوے داریوں پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنے اندازہ کے مطابق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ قابلِ سماعت یا توجہ فرمائی کے لائق ہیں کہ نہیں۔ اسی کے مطابق ان کو ایک دوسرے سے جُدا کیا جاتا ہے۔

ہر صاحبِ معاملہ سے متعلق مقدمہ کے دو امور کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس مرحلہ تک تو اس فقیر کا یہ معاملہ ''نوید بر نوید'' اور ''امید در امید'' کا سا انداز رکھتا ہے افضل مذکور کی عنایت سے اس میں کچھ رخنے پیدا ہوگئے تھے لیکن تائیدِ غیبی اور فضل ربّی کی بدولت میرا معاملہ اس کی رسائی سے بچ گیا اور یہ گتھی بھی بڑی خوبی اور خوب صورتی کے ساتھ کھل گئی۔

افضل نے مجھے سنیّوں میں رافضی اور شیعی مسلک کے لوگوں میں صوفی مشرب قرار دیا اور شعرائے کلکتہ کے سامنے میرے معاملہ کو اس طرح شہرت دی کہ یہ شخص جس کا نام اسد اللہ اور جس کا تخلص غالبؔ ہے اس شہر کے سخن وروں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

اس طرح اِس افضل بیگ نے اُن لوگوں کو میرا مخالف بنادیا اور ان کے

ذہنوں میں میری طرف سے ایک (طرح پر) شورش پیدا کر دی۔ مولوی عبدالکریم کے عزیزوں میں ایک شخص نے محض میری تذلیل وتحقیر کے لیے اپنے مکان پر ایک مجلس شعرا کے انعقاد کا اہتمام کیا کلکتہ کے شاعروں کو رقعے لکھے اور مجھے بھی شرکت مشاعرہ کی دعوت دی۔

ریختہ کہنے والوں کو مصرع ریختہ اور فارسی گویوں کو فارسی کا مصرع بطور طرح بھیجا۔ چنانچہ ماہ جون کے پچھلے یکشنبہ کو مشاعرہ کی تاریخ رکھی، میں بھی گیا اور دونوں زبانوں میں دی گئی طرحوں کے مطابق غزلیں لکھ کر لے گیا۔ اسے عنایتِ ایزدی سمجھنا چاہیے کہ میری دونوں غزلوں کو عوام وخواص نے پسند کیا اور انسے لطف اندوز ہوئے۔

اہل انصاف کے گروہ میں سے کسی نے کہا کہ جس آدمی کا کلام فصاحت و بلاغت کے اس معیار پر فائز ہو قتیل کی اس کے سامنے کیا حیثیت ہے بلکہ بات تو ہمارے اس دور سے پہلے آنے والے شاعروں تک پہنچتی ہے ان میں۔ بیدلؔ جیسے شعرا کے نام آتے ہیں۔ اگر یہ ان سے ہم سری کا دعویٰ ہے تو یہ دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہیں بلکہ یہ اسے زیب دیتا ہے۔

اب یہ میرے خداوند کا کرم ہے کہ جو ہنگامہ میری رسوائی اور میری بے اعتباری کی غرض سے برپا کیا گیا تھا وہ میرے لیے وجہِ شہرت و باعثِ عزت بن گیا۔ خاطر عاطر جمع رہے کہ میں کلکتہ کی آب وہوا سے بھی خوش ہوں کہ میری صحت کے لیے موافق ہے اور اپنے مقدمہ کی امید افزا شروعات سے بھی کہ اس میں میرے لیے بہت سی خوش آیند باتیں ہیں۔

اگرچہ میں ضعیف وناتواں ہوں لیکن میرا خداوند تو قوی ہے یقین فرمایئے

اگر مقدمہ کی شروعات میرے لیے اتنی اچھی نہ ہوتی تو آج میری جگہ یا شہر حیدر آباد میں ہوتی یا پھر دیارِ عجم میں۔ کلکتہ سے میرا دانا پانی اٹھ جاتا اور اب تک اپنا گھوڑا اور جو بھی دوسری چیزیں میرے پاس ہیں ان کو بیچ کر میں نے آوارہ گردی اختیار کر لی ہوتی۔

امید کی قوّت نے مجھے اقامت کی طاقت بخشی۔ یہاں مجھے اپنی اقامت کے بارہ میں کچھ کہنا ہے اور صفحۂ آئندہ پر اسی سے متعلق کچھ تفصیلات ہیں۔

.....

مخفی نہ رہے کہ فقیر نے بڑی بے سروسامانی میں وطن کو خیر باد کہا اور گھر میں بالکل جھاڑو دے دی اور شہر و اہل شہر سے بیگانگی اختیار کی۔ جب میں باندا پہنچا تو میں نے نواب صاحب سے دو ہزار روپیہ بطور قرض حاصل کیا جو انہوں نے دے دیا اور میں نے اپنے دل میں کہا غالب یہ بھی بسا غنیمت ہے لے لے اور اپنی راہ پر چل کھڑا ہو۔

اگر تیرے مقدمہ کی کلکتہ میں شنوائی ہوئی تو زہے قسمت بصورت دیگر (وہاں سے) اُلٹے قدموں واپسی اختیار کر لینا۔ اور قلندرانہ وضع اختیار کر کے دنیا جہان میں آوارہ گردی کرنا۔ ''ہر چہ بادا باد'' موسم زمستاں کی کچھ ضرورتوں کا اہتمام کیا بادیہ گردی و دشت نوردی کرتا ہوا کلکتہ پہنچا۔

ورود کے دن میرے پاس.... چھ سو روپیہ تھا شعبان، رمضان، شوال اور ذی قعدہ گزر گئے اب ذی الحجہ کا مہینہ آ گیا ہے اگر کوئی آفتِ ناگہانی آسمان سے نازل نہ ہوئی تو آئندہ دو ماہ تک مزید مجھے فکر روزی سے فراغت رہے گی۔ میں نواب کی طرف

سے دستگیری کی ایک موہوم سی توقع رکھتا رہا ہوں ابھی کہہ نہیں سکتا کہ یہ کس حد تک درست (خیال) ہے۔

جب میں نے جناب والا کو خط لکھا تو ایک مکتوب اس سے پہلے نوّاب کو بھی لکھا تھا اور باقی خط اپنے احباب اور اعزا کو جدا جدا ارقام کیے تھے۔ اگر جناب والا تک میرے عرض نامے پہنچ گئے تو وہاں بھی پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن ابھی تو وہی صدائے برنخاست کا معاملہ ہے تا اینکہ جو اِس قدر گرم جوشی و لطف نمائی کے ساتھ پیش آئے تھے ان کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں موصول ہوا۔

بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میں نے نواب سے مزید اعانت چاہی تھی اور ایک ہزار روپیہ طلب کیا تھا۔ لیکن اب توقع اٹھتی جا رہی ہے اور دل و دماغ پر وحشت طاری ہو رہی ہے۔

امید یہ کہ آپ تھوڑی سی زحمت گوارا فرمائیں گے اور کوشش کر کے میر کرم علی کو اپنے پاس بٹھا کر اس صورت حال کے رخ سے پردہ اٹھائیں گے کہ آخر معاملہ کیا ہے اور کس طرح کی سوچ سے کام لیا جا رہا ہے تا کہ یہ معلوم ہو کہ نواب اور دوسرے اہل دربار کا میرے بارہ میں عِندیہ کیا ہے۔

میں نے نوّاب اور ان کے مقربوں سے بھی اپنے مقدمہ کو چھپایا نہیں بلکہ ہر عریضہ اور ہر صحیفے میں اس بات کو لکھ دیا ہے اور کہا ہے کہ مقابلہ کوہ اور کاہ کے درمیان ہے۔

توقع یہی تھی اور ہے کہ اس معاملہ میں نوّاب کا دست معاونت میری طرف بڑھے گا اور وہ دست کشی اختیار نہیں کریں گے۔ میں نے چشم سخن سے اس طرف اشارہ

کیا تھا، کہ نواب معلی القاب کی پشت پناہی سے میں احمد بخش خاں کے جانشین سے اپنا حق لے سکوں گا اور ان کے ہوا خواہوں کو بتلا سکوں گا کہ میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔

ابھی تک ان کی طرف سے نفی و اثبات میں جواب نہیں آیا

میں آوارہ وطن اور غریب الدیار منتظر بیٹھا ہوں کہ آخر کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ ان دوستوں کی دوستی پر حیران ہوں کہ انہوں نے کس طرح آنکھیں پھیر لیں اور دشمن کے حلقۂ ہائے دام میں جا پھنسے۔

حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ میر کرم علی سے ملاقات فرمائیں اور تفتیش احوال کریں اور جو باتیں معلوم ہوں انہیں بے تکلف و بے تامل مجھے لکھ بھیجیں جو خط اس سے پیشتر لکھے گئے ان کے متعلق بھی ضروری باتوں کو اپنے جواب میں ضرور شامل کریں کہ دو ماہ کی فرصت اب اتنی بھی زیادہ نہیں کہ جواب نگاری میں تاخیر کو جائز رکھا جائے۔ مجھے اس دیار سے اپنے ''دار المحن'' کو بھی تو واپس جانا ہے بنا بریں (مجھے) بڑی بے چینی سے جواب نامہ کا انتظار رہے گا اور بس۔

ہر چند دو ماہ میں بہت سی راتیں اور دن باقی ہیں اور توکل کرنے والوں کی تو بات ہی الگ ہے کہ اگر اُن کے روز قتل کی صبح میں ایک رات باقی ہو تب بھی ان پر خوف و ہراس طاری نہیں ہوتا لیکن شہریت کے تقاضے کچھ اور ہیں کہ وہ کبھی آدمی کو ماضی کی الجھنیں یاد دلاتے ہی اور کبھی مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ غرض کہ آئینہ، ضمیر پر اپنی پرچھائیاں ڈالتے رہتے ہیں۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ماضی و مستقبل سوائے لمحۂ حال کے کچھ نہیں اور حال خود ایک نقطۂ موہوم ہے کہ جسے گردش فلک کے ذیل میں فرض کیا گیا اور خود گردش افلاک

بھی ایک کیفیت ہے اور عالم وہم وخیال کی طرف اشارہ۔

لاموجود االا اللہ لاموثرِفی الوجودِ الااللہ

(اسداللہ)

میرے مخدوم ومکرم

میں جانتا ہوں اور میرا خدا، کہ اس حسن اتفاق پر میں کس حد تک شادمانی ومسرت محسوس کرتا ہوں کہ میری خطاے بے اثر کہ طرازِ قبول سے بیگانہ ہے۔ جس طرح اہل ہوس کا نالۂ بے داد آسمان تک تو کیا جاتا زمین تک بھی نہیں پہنچتا، اس ''عبودیت نامہ'' کے خاتمہ پر اس نے شرف قبول پایا۔ اس مشتاق کے دل کا نقش مدّعا اپنی بلند کرسی پر متکن ہوا۔

اسی کے ساتھ نفاق وفاق کی زحمت وکشمکش بھی درمیاں سے اٹھ گئی۔

اس پیشتر میں حضرت والا کی خدمت میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ راجہ بنارس نے نواب گورنر جنرل بہار کی خدمت میں پہنچنے کی استدعا کی تھی جو قبول فرمالی گئی اور دربارِ عام کے موقع پر حاضری کی اجازت دی گئی وہ صورت باقی رہی اور کسی کو خبر نہ ہوئی کہ واقعتاً کیا ہوا۔ جمعہ کے دن فروری کی چودہ تاریخ کو جب صاحب سکرتر بہادر کے عملے کے برخاست ہونے کا وقت آیا میں جس کے بندگانِ بارگاہ میں سے ہوں نائب میر منشی سے جو میر منشی کی غیر حاضری میں کام کر رہے ہیں یہ کہا گیا کہ اس دربار میں بار پانے والوں کو یہ اطلاع دے دی جائے کہ دوشنبہ کا دن باریابی کا دن ہے وقتِ معینہ پر خود کو درِ دربار تک پہنچائیں۔

اسی اثناء میں ایک خط رات کے وقت مجھے ملا کہ آنے والی کل جو شنبہ کی

رات ہوگی میں اپنے آپ کو صاحب والا کی خدمت میں پہنچاؤں میں نے ایسا ہی کیا اور تمنائے ملازمت کی، انتہائے مہربانی سے اسے قبول کرلیا گیا۔

مجھ پر عنایت کی گئی ہے میرا نام اصحابِ یمین کی صف میں درج کرلیا گیا اور کرسیِ اعتبار پر نشست دی اب یہ حسنِ اتفاق ہے کہ کرسی نمبر ا راجہ بھوپ سنگھ جانشینِ راجہ کلیان سنگھ کے لیے مختص تھی نمبر ۲ اُن کے والد کے واسطے، کرسی ۳ شاہ دہلی کے سفیر کے لیے تھی اور چہارم سفیر شاہ اودھ سے متعلق تھی کرسی ۵ وکیل ہمایوں جاہ، نواب مرشدآباد کی نشست کے واسطے بچھائی گئی تھی اور ششم نمبر پر آنے والی کرسی وکیل جودھ پور کے لیے رکھی گئی تھی، ہفتم وکیل جے پور سے متعلق تھی اس کے بعد نمبر ۸ والی کرسی مہاراجہ نیپال کے وکیل کے لیے مخصوص تھی۔ نویں نمبر کی کرسی میرے قبلہ وکعبہ نواب علی اکبر طباطبائی دام اقبالہ کی نشست سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے بعد نشان دس والی کرسی مجھ نیازمند کی عزت افزائی کے لیے خاص کی گئی تھی۔

اس بات پر میں جتنی مسرّت کا اظہار کروں کم ہے کہ مجھے اس انجمن میں اس شخصیت کے پہلو میں جگہ دی گی تھی کہ جن کی ذات والا صفات کو میں نے بنگال کے عمائد میں بطورِ خاص چنا ہے کہاں تک لکھوں۔ لیکن افسوس کہ نواب صاحب ہگلی سے تشریف نہیں لائے۔ انہوں نے معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔ جو بہت ہی مفید مطلب اور مختصر تھا۔ صاحب والا مناقب کی عنایات کو اپنے بارہ میں اس طرح پیش از پیش دیکھا تو میرے دل میں خلعت پانے کی آرزو پیدا ہوئی اور میں نے اس کا اظہار کیا۔

کچھ دیر وہ سر جھکائے رہے پھر سر اٹھایا اور بہت ہی دل فریب انداز میں کہا۔ صاحب اس وقت تو اس کا کوئی موقع نہیں کہ کسی کا نام اہلِ دربار کی فہرست

میں بڑھایا جائے۔

ہم نے تمہاری دل جوئی کی ہے اور تمہاری رعایتِ خاطر کے لیے ایسا کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خلعت نہیں دلوایا جا سکتا لیکن اس وقت خلعت کی گراں مایگی کی کفالت ممکن نہیں تھی تم خود سوچو کہ تمہارے چچا جو انگریز کمپنی بہادر کے متوسلوں اور سرکردہ لوگوں میں تھے ان کو بھی کبھی خلعت پانے والوں کے زمرے میں شامل نہیں کیا گیا۔

وہ جاگیر پانے کے بعد دس ماہ میں گزر گئے اب تمہارے حال کو شرح و بست کے ساتھ کونسل کو لکھ بھیجنا اور تمہارے بزرگوں کے نام کی مناسبت سے خلعت حاصل کرنا صورت پزیر ہونے والا عمل نہیں حالانکہ تم نے ایک عجیب امر خلعت پر اضافہ کیا ہے اب تم صبر کرو اور سکون سے رہو یہاں تک کہ رخصت کا وقت آجائے تب تمہارے لیے گراں مایہ خلعت اور بہادر کے خطاب کی شفارش کی جائے گی جس کی تم تمنا کر رہے ہو ارلارڈ صاحب کی بارگاہ سے اس کے لیے پروانہ حاصل کیا جائے گا کیونکہ بات بہت ہی نرمی اور خوب صورتی سے کہی گئی تی اس لیے میں خاموش ہو گیا۔

قصہ مختصر یہ کہ دوشنبہ کے دن میں بارگاہِ گورنری میں پہنچا تو جو لمبر نواب علی اکبر خاں کا تھا وہ خالی تھا اس کو اسی طرح چھوڑ دیا گیا اور میں دسویں نمبر کی کرسی پر بیٹھا جب نواب گورنر جنرل بہادر پہنچ گئے اور اہلِ دربار کی طرف سے نذر گزارنے کی نوبت مجھ تک پہنچی میں نے دو اشرفیاں پیش کیں رسمِ عام کے خلاف مجھے اس سے معاف فرماتے ہوئے میری نیازمندی کو اپنی نگاہِ پرورش اور چشمِ عنایت سے نوازا گیا۔ عطر و پان اپنے ہاتھ سے عنایت کیا۔ دوسرے اُمور کو اس وقت رسم کے مطابق ملتوی فرمایا۔

سفیر دہلی، سفیر شاہ اودھ، وکیلِ نواب مرشد آباد نے اپنے موکلوں کے شوقِ ملاقات کو بیان کیا تو گورنر جنرل بہادر نے فرمایا کہ جب ہم ان اضلاع کے دورے پر جائیں گے تو ملاقات کا موقع آئے گا۔

اس سے پیشتر یہ سننے میں آیا تھا کہ نواب گورنر جنرل بہادر معہ اراکین کونسل اوران افراد کے جو عملۂ کونسل میں شامل ہیں ہندوستان کی طرف سفر اختیار فرمائیں گے اب معلوم ہوا کہ وہ ارادہ اسی طرح ہے کہ اراکینِ کونسل گورنر جنرل کے ہم عنان ہوں یا پھر یہیں رہیں (یہ بھی ہوسکتا ہے) پہلی صورت میں مجھے بھی افتان وخیزاں (گرتے پڑتے) دہلی کی طرف سفر کرنا ہوگا بصورتِ دیگر میں یہیں رہوں گا مولوی فضل حق صاحب کے نجی خط میں (جو دہلی سے پہنچا ہے) اس حقیقت کی خبر درج ہونی چاہیے کہ وہاں صورتِ حال کیا رہی ۱۷ فروری مطابق ۱۲ شعبان روز سہ شنبہ ۱۸۲۹ء۔

(محمد اسد اللہ)

حق پرستوں کے قبلہ

شوق میرے دل میں جوش مارتا ہے تو میں القاب و آداب کے، رسمی تکلفات کا تقاضا پورا نہیں کر پاتا۔ بلکہ پیرایۂ بیان کا سر رشتہ بھی جیسے میرے دست نگارش سے باہر نکل جاتا ہے اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ ''لکھنا، کہنے'' کے برابر ہو تو اول و آخیر ہی کا مجھے کچھ خیال آتا ہے نہ سخن کی درازی کے باب میں سوچ پاتا ہوں نہ اختصار کے بارہ میں۔

راہِ گفتگو کے نشیب و فراز کو میں مجنونانہ انداز سے طے کرتا ہوں اور اس وادی میں ''عناں گسیختہ'' گام فرسا رہتا ہوں ''مستانہ طے کروں ہو راہِ وادیِ خیال''۔ اور

چاہتا یہ ہوں کہ جو بھی میرا حال ہے حضرت والا کے علم میں آجائے۔ ذہن اس کشمکش میں پھنس کر رہ گیا ہے۔

اس سے بیشتر ہفتہ کے شروع میں پنج شنبہ کے دن صبح کے وقت مولوی ولایت حسن خاں اچانک میری قیام گاہ پر پہنچے اور دَر سے اندر آئے اور مجھ سے وداع مانگی کہ میں پا بہ رکاب ہوں اور بہ تقریبِ دورہ، سفر کا ارادہ رکھتا ہوں اب میں صبح جا رہا ہوں، میں اپنے غم کدہ کے دروازہ تک برسمِ مشایعت، ان کے ساتھ آیا اور انہیں خدا حافظ کہا۔

روانگی کے وقت مجھ سے کہا کہ میر صفات علی خاں میرے احباب میں سے ہیں میرے جانشین اور میرے وکیل ہیں۔ طریق مراسلت سے بھی انہیں بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ چند روز کے بعد جب کہ نوازش نامہ کے شوقِ وُرود نے مجھے بیتاب کر دیا، ایک آدمی کو میں نے آں موصوف کے پاس بھیجا (جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے) اور باندے کے خطوط کے بارہ میں دریافت کیا۔ جواب آیا ہاں کل باندے سے خط آیا تھا۔ جسے چلہ تارا بھیج دیا گیا۔ دل نے گواہی دی کہ اس ملفوف میں وہ خط بھی ہوگا جو غالب کی سرفرازی کے لیے منشور سعادت کے طور پر لکھا جانا چاہیے۔

ان حالات میں مجبوراً انتظار کرنا پڑا۔ اور میں نفس شماری کرتا رہا۔ تا کہ آج کہ سہ شنبہ کا دن اور جمادی الاول کی سترہ تاریخ ہے۔ میر صفات علی خاں کا آدمی پہنچا اور مولوی ولایت حسن کا خط پہنچایا۔ اس کا عنوان معنی ربوبیت کا معمہ تھا یعنی میں نے خط کھولا۔ بخششوں سے بھرے اس خط کی تحریر نظر میں آئی۔ میری فکر نے اس کے حرف والفاظ کا طواف کیا اور اس خبر نے کہ ابھی تک دہلی میں میرا مقدمہ پیش نہیں ہوا۔

میرے دل کو بے پناہ طریقہ پر شورش کدہ بنا دیا۔ اب میں دوسری کسی فکر فضول سے دامن کشی کر کے اور شش جہتی سے اپنی توجہ کو ہٹا کر نفس مقدمہ کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں۔

جس وقت کہ کاؤنسل کے اراکینِ اربعہ کی پیش گاہ سے دارالخلافہ کی طرف روانگی کے لیے مامور کیا گیا۔ میں اس کی فریاد منیم کے پاس لے کر گیا اور میں نے اپنی ناتوانی اور بے سروسامانی کا ان سے قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

مخفی نہ رہے کہ یہاں ایک امیر ہے۔ بہت ہوش مند اور ذی وقار مسٹر اندرواسٹرلنگ اس کا نام ہے کہ وہ اس کاؤنسل کے خاص ممبروں میں سے ہے۔ گویا اس کی قوس عروجی کا بابِ اول ہے۔ اور قوسِ نزلی کا نقطۂ آخر دادخواہوں کے فریاد ناموں کو وہ داوران کاؤنسل تک اور حاکمانِ کشور کے، فرمانوں کو، فریاد کرنے والوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ انگریز افسر میرا ہمدرد ہے اور میرے حالِ زار پر نظر رکھتا ہے۔

جب اس نے میری فریاد کو سنا، تو میرے اوپر رحم کھایا اور کہا اگر تم نہیں جا سکتے نہ جاؤ صرف مقدمہ کے کاغذات دلّی بھیج دو میں یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میرا یہ تامل میری مجبوریوں کے باعث تھا، اس حاکم نے یہ سمجھا کہ میں حاکمِ دہلی کی بے توجہی کے خیال سے سوچ میں پڑ گیا ہوں۔

میرے قریب آکر اس نے کہا، کیا سوچ رہے ہو اور کس پریشانی میں ڈوبے ہوئے ہو۔ تمہارا مقدمہ قابل سماعت ہے صاحب ریزیڈینٹ بہادر دہلی سنیں گے اور ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ یہ سن کر میرے دلِ شوریدہ کو ایک گونہ آسودگی میسر آئی

اور وحشت کم ہوئی۔

میں گھر واپس آیا۔ دہلی کے دوستوں کے معاملہ کی تصویر میرے پیش نظر تھی کہ اس وقت مجھ سے ہمدردی کا سلوک کون کرے گا اور میں اس مقدمہ کے سلسلے میں اپنا وکیل کسے بنا سکتا ہوں چونکہ ''مدّعی'' دوسری باتوں سے قطع نظر امارت واقتدار میں صاحبِ امتیاز ہے اور اس کا شمار دہلی کے رؤسا میں ہوتا ہے کیا کچھ ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو میرے دشمن کے رعب ودبدبہ کا خیال نہ کریں؟

میرے ہم وطنی کے رشتوں پر بیگانہ نظر داری اور میرے دشمنوں کی بے پردہ حمایت وطرف داری کی وجہ سے کہ میں ایک بدنصیب آدمی ہوں اور مجھے خدشہ اس امر کا ہے کہ یہ لوگ مجھے چھوڑ کر میرے دشمن کے ساتھ ہو جائیں گے اور میری تباہی وبربادی میں اس کے ساتھ شریک ہونا پسند کرینگے کہ یہ اس ''عالم کون وفساد'' میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرا دل مولوی فضل حق خیرآبادی کی ذات گرامی کی طرف مائل ہوا۔ مولوی فضل حق ابن مولانا فضلِ امام خیرآبادی منشی برکت علی خاں مرحوم کے سلسلۂ اولاد میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ خود عدالت فوجداری ودیوانی کے سررشتہ دار بھی ہیں اللہ پاک ان کو زندہ وسلامت رکھے اور مراتب بلند تک پہنچائے۔

میں نے ان کو اپنا مخاطبِ صحیح قرار دیا ہے اور انہیں اس کے لیے قبول کر لیا ہے۔ انہیں لکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اس معاملہ میں میری چارہ سازی کی زحمت گوارا فرمائیں تو میں مقدمہ سے متعلق امور کو ان کے سپرد کر دوں۔ چونکہ موصوف مخلص دوستوں میں سے ہیں اس لیے انہوں نے وکیل کا انتخاب فرمایا اور مجھے اس سے

آ گاہی بخشی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں نے مقدمہ کے کاغذات کاؤنسل میں پیش کی جانے والی دستخطی عرضی اور کاؤنسل کے سکتر صاحب کا دستخطی نگارش نامہ جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ازروئے دستور اس عرض نامہ کو پہلے ریزیڈینٹ صاحب دہلی کی جناب میں پیش ہونا چاہیے۔

اسی کے ساتھ بنائے مقدمہ کی استواری کی غرض سے صاحب عالی شان کی چٹھی جو کول بروک صاحب کے نام ہے نیز مخدومی نواب علی اکبر خان کا مکتوب گرامی منشی التفات حسین صاحب کے نام۔ ان سب کاغذات کو ایک لفافے میں ہم نورد کر کے میں ڈاک خانے لے گیا۔ اور صاحبِ ڈاک خانہ اور پوست خانے کے دوسرے کارپردازوں کے دستخط ان کاغذات پر لے لیے۔

لفافہ کے سرے پر لاکھ کی مہر لگادی جب اس ملفوف کا وزن کیا گیا تو دس روپے محصول ڈاک کے برابر آیا۔ انگریزی ڈاک میں بہ سلسلۂ محصولات دستور ہے کہ جو انگریزی ڈاک دہلی کے لیے روانہ کی جاتی ہے اس میں ایک روپیہ کے برابر وزن پر اتنا ہی ڈاک خرچ بھی لیا جاتا ہے۔

غرض کہ میں نے دس روپیہ محصول کل کا کل ادا کر دیا۔ اور ڈاک کے محکمہ کی طرف سے اس کی رسید لے کر اپنے غم کدے پر واپس آ گیا۔

اس روز، سہ شنبہ کا دن تھا اور ماہ صفر کی ۱۴ ر تاریخ رہنوز ڈاک سے بھیجے گئے ان کاغذات کے دہلی پہنچ جانے کی مدت ختم نہ ہوئی تھی کہ مولوی فضل حق خیرآبادی کا مکتوب گرامی پہنچا کہ اپنی طرف سے دستخطی مختار نامہ جس پر مہر بھی لگی ہو رجسٹری کے

بغیر نہیں بھیجا جانا چاہیے۔

وجہ یہ ہے کہ جو مختار نامہ دستخطی میری مہر کے ساتھ وہاں بھیجا گیا ہے وہ رجسٹر شدہ ڈاک سے نہیں بھیجا گیا۔ اسی روز اسٹامپ خریدا، اس پر مختار نامہ لکھا گیا اس پر دستخط و مہر ثبت کیے گئے اور اسے رجسٹری کے وسیلہ سے روانہ کیا۔ اور اس میں کسی طرح تاخیر نہیں ہوئی۔

چنانچہ اس قطعہ کی روانگی کی تاریخ چہارم ربیع الاول ہے کہ یک شنبہ کا دن تھا، آج کی تاریخ تک کہ ماہ جمادی الاول کی ۱۷/ یا ۱۸/ تاریخ ہے ہنوز اس نامہ کے وہاں پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی اور اِس ہنگامہ کے سامنے آنے کے کوئی آثار نہیں اس وقت تک میں سات آٹھ خط اور بھی بہ سبیل ڈاک بھیج چکا ہوں اور کسی کا کوئی جواب نہیں آیا کارفرما و چارہ گر کا یہ حال ہے تو میری درازنفسی و شوریدہ سری کیا معنی رکھتی ہے۔

میرے گھر کا حال یہ ہے کہ میرا ایک بھائی ہے دیوانہ اور از خود بیگانہ۔ اب اس سے زیادہ اس کا حال یں کیا بیان کروں بس یوں سمجھیے وہ بھی میری طرح ہے تین عورتیں کہ وہ پردہ نشیں پا شکستہ در شکستہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں ایک بے شوہر ہے اور دوسری با شوہر ہے مگر زن وہ زنِ برادرو (مدّ عاعلیہ) خواجہ حاجی ہے۔

میرا اس مقدمہ کے سلسلہ میں سب سے بڑا اعتراض ہی یہ ہے کہ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے وارثوں میں خواجہ حاجی کو غلط طور پر شامل کیا گیا ہے کہ یہی شخص اس مقدمہ کی ترکیب کا جزو اعظم ہے لازماً مجھے اس سے وحشت ہوتی ہے اس نوع کی باتیں فتوائے خرد کے ذیل میں آتی ہیں دستور وہم کے زُمرہ میں نہیں۔

تیسری عورت کا شوہر، نسلِ سادات دہلی سے ہے۔ فتوائے عقل اور وہ بہ حلف یہ ہے کہ یہ آدمی اہل جنت میں سے ہے آدمی خاک سے بنا ہے اور سید نور سے۔ اس نسبت کے ساتھ کسی سید کا آدمیت سے کیا رشتہ ہے۔

چونکہ اسے سوچ سمجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں نے اسے اس بات پر مقرر کیا ہے کہ وہ مقدمہ سے متعلق باتیں اور خبریں لکھتا رہے اور گاہ گا بلکہ اکثر مخدومی مولوی فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں حاضری دیتا رہے۔ میں اس کے جدِ امجد کے قربان ہوں کہ دو تین ماہ میں مجھے صرف ایک خط لکھا اور اس میں بھی مقدمہ کے سلسلہ میں کوئی دل خوش کن اور اُمید افزا بات نہیں لکھی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آخر کس سے فریاد کروں آپ خدارا توجہ فرمائیں میری بیکسی کی داد دیں کہ میں اس بارے میں کتنا پریشان ہوں کہ میرے مقدمہ کے کاغذات دہلی پہنچے یا نہیں میں سوچتا اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ انگریزی ڈاک میں کاغذ ضائع نہیں ہوتے۔ اور میں نے تو مہر زدہ کر کے باقاعدہ ڈاک خانے پہنچ کر صاحبانِ محکمۂ ڈاک کے سپرد کیا ہے اس میں تلف ہو جانے کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اب اگر وہ لفافہ کہیں محکمۂ ڈاک میں تلف ہوا اور اپنی منزل گاہ یعنی مکتوب الیہ تک نہیں پہنچا تو پھر میرے کسی آدمی کو یا اہالیان دفتر میں سے کسی کو یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ تمہارے مرسلہ کاغذات ہنوز موصول نہیں ہوئے میں اپنی اس بے خبری پر پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔

مجھے اپنے مکتوب کے نہ پہنچنے کی اطلاع ہے نہ ضائع ہونے کی خبر۔ کسی بات پر بھی تو کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا بجز اس امر کے میں قرائن و علامات کے بارہ میں سوچتا

اور پیکر خیال کو گردش دیتا رہوں۔

غرض کہ تین ماہ ہو گئے میں اپنے غم کدہ میں نقش بدیوار بنا بیٹھا ہوں، نہ کوئی ایسا محرم ہے کہ جس سے راز دلی کہا جا سکے نہ کوئی ہمدم و دمساز۔ خود ہی دیوانہ ہوں اور خود ہی ناصح مشفق خود ہی بیمار ہوں اور خود ہی تیماردار۔

ہفتہ میں ایک آدھ بار منیم کے پاس چلا جاتا تھا کہ میں پیش رو سے ان کا متعارف بھی تھا اب میں یہ بھی نہیں کر سکتا اور آمد و رفت کے اس سلسلہ سے بھی اپنی درماندگیوں کے باعث محروم ہوں۔

اس لیے کہ اگر میں وہاں جاؤں اور وہ مقدمہ کی کارروائی میں ہونے والی پیش رفت کے بارہ میں سوال کرے تو میں کیا جواب دوں۔ کیا یہ کہوں کہ میں نے ہنوز کاغذات کو دہلی نہیں بھیجا اور بھیجا ہے تو پھر کیا ہوا اس کے بارہ میں سوال کرے تو میرے پاس کیا جواب ہے کہ یہ ہوا۔

بہر حال جو بھی ہے ٹھیک ہے للہ الحمد کہ جس سے کشودِ کار متعلق ہے وہ ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کی روش پر شور و واویلا کیا جائے اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہونے کے ماسوا اور کوئی صورت موجود ہی نہ ہو۔ جو شکوہ ہے وہ اس کے تغافل سے ہے۔ شاید وہ یہ سوچ رہا ہے کہ جب کوئی صورتِ حال سامنے آجائے تو پھر زبانِ گفتگو اور قلمِ نگارش کو جنبش دے۔

منشی محمد حسن کا خط اپنی تاریخ تحریر کے اعتبار سے ایک ماہ پہلے رقم کیا گیا ہے اس کی رقم فرمائی کی تاریخ کے بعد اگر کچھ اور بھی ہوا تو کوئی تعجب نہیں زیادہ تسلیم۔

(اسد اللہ)

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

(اللہ پاک ان کے مبارک سائے کو ہمارے سروں پر قائم رکھے)

سروالا کا نگاہ عقیدت سے طواف کرنے کے بعد۔ میں ہوں کہ خجالت کے باعث اپنی آنکھوں کو اپنی پشت پا سے لگائے ہوئے ہوں اور نالہ کشی کی جرأت اس خوف سے نہیں کرسکتا (کہ آپ کے سکون واطمینان میں خلل نہ پڑے)

میں بھی کیا عجیب انسان ہوں، کہ مجھے مراسمِ معذرت کی پیشکش میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ ان کی پذیرائی کے لیے اپنا سفارشی خود مجھ ہی کو بننا پڑتا ہے۔ خدارا غالب کی تلخ کامیوں پر کہ وہ ہمیشہ ''زہرابہ نوشی'' کرتا رہتا ہے، رحم فرمائیے کہ ''نیاز و نازکی ارزِش'' بھی تو اس بے نیاز مطلق کی پیدا کردہ ہے۔

کیا عرض کروں جب سے والا نامہ کے سواد تحریر سے آنکھیں روشن ہوئی ہیں اس القاب نے کہ ''قبلۂ مہجوراں سلامت'' رگِ جاں میں نشتر چبھو رکھے ہیں۔ مُدّتُ العمر جب بھی یہ دن یاد آئیں گے دل احساس جدائی سے لرز اٹھے گا۔

وہ عرضداشت کہ مولوی ولایت حسن کو بھیجے جانے والے خط کے ساتھ ''ہم نورد'' ہے) مطالعہ میں آئے گی تو حضور والا میرے سوزِ سینہ سے بھی واقف ہوں گے۔ اگر مجھے اپنا فرزند تصور نہ فرمائیں تو ''غلام زرخرید'' خیال کریں اور خواہ نخواہی ''قبلۂ مہجوراں'' میرے اختراع کردہ القاب کی تلافی کی طرف متوجہ ہوں (نامۂ عنایت تحریر فرمائیں) کہ وہی اس ننگِ آفرینش کی طرف سے ایک دستاویز ہے۔

گر تو مرا نخواہی من خویش را بہ سوزم
جاے کہ آب نہ بود، روزے کہ باد باشد

اگر تو مجھے نہیں چاہتا تو میں خود کو جلا ڈالوں گا، جہاں پانی نہ ہو مگر آگ ہو۔

میں نے اس عریضہ میں مجملاً اپنا حال احوال رقم کر دیا ہے اس اثناء میں کچھ تو صرفِ زر کے باعث اور کچھ سعی و سفارش کی بدولت میں نے حاکم دہلی کی رپورٹ، اس پر بطور ضمیمہ جو حکم ہے، ان دونوں کی نقل حاصل کر لی ہے اُسے اس عرض داشت کے ساتھ ''ہم نورد'' کر کے جناب والا کی خدمت اقدس میں روانہ کر رہا ہوں۔

صحیفہ سے متعلق باقی کچھ وضاحتیں بھی ہیں چاہے وہ آگ میں پھینک دینے کے لائق ہوں خواہ پانی میں دھوڈالنے کے وکیل کا خط ہنوز نہیں پہنچا۔ کہ اس سے کوئی تازہ خبر ہم دست ہو۔

لیکن صحیفہ وارد کے مطالعہ سے اتنا ضرور واضح ہوتا ہے کہ وکیل کے خط یا خطوں میں درنگ کو خوش آیند خیال کیا جانا چاہیے نہ کہ خوف دلانے والا۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر کی بات ہے کہ اکبر آبادی ہنڈی پہنچی، جب میں نے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چار سو ستر اور پانچ پچھتر روپے کی ہے، اس کی رقومات کو میں نے وصول کر لیا۔ اور اس سے متعلق جواب اکبر آباد ارسال کر دیا۔

ہنوز ملازمان والا کی طرف سے جو عطا فرمایا گیا ہے اس کا بھی کچھ حصہ باقی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے معاملہ میں ارکان کونسل کی روانگی سے پیشتر کوئی کارروائی عمل میں آجائے گی۔ خداوندِ نعمت کے بندگان میری جانب سے خاطر عاطر کو قرین جمعیت رکھیں (بہ اطمینان رہیں) کہ وہ اضطراری حالت نہیں ہے کہ میں خوامخواہ تقاضہ سنج ہوں یا ناوب کے آدمیوں کے سامنے اپنی اس ضرورت کے باعث دریوزہ گری کی خاطر ہاتھ پھیلاؤں۔ امید کہ اب ان لوگوں سے اس باب میں جناب

والا کوئی گفتگو بھی نہ کریں گے۔ اس راز کے جو محرم ہیں وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔

منشی عاشق علی خاں کلکتہ سے براہِ دریا بتاریخ یکم ذی الحجہ روانہ ہو گئے۔ لیکن سمتِ سفر مجھے معلوم نہیں حکیم ظفر علی خاں نام فیض آباد کے اشراف میں ایک صاحب ان کی گہ پر لکھنؤ سے سلطنت اودھ کے سفیر بن کر یہاں پہنچ چکے ہیں۔

مولوی عبدالکریم جو آٹھ ماہ کی رخصت پر لکھنؤ گئے ہوئے تھے وہاں سے واپس روانہ ہو گئے ہیں اور عظیم آباد تک پہنچ چکے ہیں۔ گمانِ غالب ہے کہ وہ ماہ رواں کے آخر تک یہاں پہنچ جائیں گے۔

منشی محمد حسن نے دہلی پہنچ کر، اپنے عہدۂ قدیم سے متعلق فرائضِ منصبی کی ذِمّہ داریوں کو سنبھال لیا ہے۔

نواب علی اکبر خاں کام و حکام کی کشاکش سے فراغت پا کر، ہگلی میں آرام فرما رہے ہیں۔ اکثر آموں کا تحفہ ان کی طرف سے اس نیاز مند کو پہنچتا رہتا ہے اور وہ ہم ایسے ارادت مندوں کی پرورش فرماتے رہتے ہیں زیادہ حد ادب۔

اسداللہ

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

ادائے آداب و کورنش کے بعد خدمت والا میں عرض ہے کہ جو بندگی نامے برابر ارسال کیے جاتے رہے وہ حالات و واقعات کے آئینہ دار بنے ہوں گے۔

صاحبِ سکتر بہادر کی کرم فرمائیوں اور نواب گورنر جنرل بہادر کی بارگاہ میں

حاضری سے متعلق جو کچھ میرے قلم سے معرض اظہار میں آیا ہے وہ نظر اقدس سے گزر چکا ہے نئی بات یہ ہے کہ آج جب رمضان المبارک کی تیسری تاریخ اور دوشنبہ کا دن ہے میرے وطن کے زاویہ نشینوں کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ہے۔

اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ ماہ شعبان کی پانچ تاریخ کو تمہارا مقدمہ مسل کے کاغذات میں شامل ہوگیا۔ اگر چہ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ نہ آئی لیکن میری عرض داشت حکام دہلی کی نظر گاہ میں پہنچ گئی اتنی بات تو اس سے بہر حال معلوم ہو جاتی ہے۔

گمان غالب یہ ہے کہ اس ہفتہ کوئی خط یا کار فرمایان عدالت کی طرف سے آ جائے گا، یا وکیل مقدمہ کی طرف سے کوئی نامہ موصول ہوگا جو کاشف حالات بن جائے گا۔ نیز یہ کہ نواب علی اکبر خاں بہادر نے شادی کی مصروفیات سے فراغت پائی۔

چونہ باریابی کے دن لاٹ صاحب نہیں آئے اور نواب صاحب کی جگہ۔ اپنی برابر کی کرسی میں خالی پائی لہٰذا میں نے اپنا عریضہ ہگلی بندر بھیج دیا اور جو یائے حلات ہوا جو ان کے کلکتہ تشریف نہ لا سکنے کا باعث ہے۔

تحریر سے یہ پتہ تو چل ہی گیا کہ نواب صاحب کی طبیعت آج کل ناساز چل رہی ہے میں عیادت کے لیے گیا پانچ راتیں اور پانچ دن وہاں بسر کے کل وہاں سے واپس ہوا اور اپنے زاویۂ ناکامی کی طرف مراجعت کی۔

جو آدمی کہ میرے غیاب میں مکان کی حفاظت پر مامور تھا اس نے دہلی سے آنے والا خط مجھے دیا۔ اس میں جو اطلاع دی گئی تھی وہ میں نے سطور بالا میں لکھ دی۔

نواب صاحب گردہ کی پتھری کے مرض میں مبتلا رہے ہیں لیکن جلد ہی اس سے نجات مل گئی ظاہر ہے کہ وہ پتھری چھوٹی ہی رہی ہوگی کہ اتنی جلدی وہ تکلیف دور ہوگئی اور اب بغرضِ بحالیٔ صحت آرام فرمارہے ہیں۔اور بخیر وعافیت ہیں خاطر اقدس جمع رہے جوصورت حالات تھی اس کومیں نے جوں کے توں پیش کردیا۔

بھگوان داس کے مقدمہ کے بارہ میں معلوم ہوا اور یہ پہلے بھی وہ کہہ چکے تھے کہ اتنا روپیہ بھگوان داس کو پہنچایا گیا۔ مولوی صاحب قبلہ سے تحریر میں کچھ سہو ہوا ہے۔۔۔کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں معاملہ کی نوعیت کچھ اور تھی میں نے اپنا اور ملازمان حضرت کا فراغ خاطر اس میں دیکھا تو آں مخدوم کی انگلیوں پر زحمتِ تحریر کو ضروری خیال کیا۔

چنانچہ اُن کا تحریر فرمودہ رقعہ عرض داشت کے ساتھ "ہم نورد" ومنسلک آپ کو ملے گا۔ مستقبل کے وہم وفکر کے بارہ میں کچھ باتیں دل پر اپنا پرتو ڈالتی رہتی ہیں خبر یہ ہے کہ فصلِ برسات میں جب کہ بنگال کی ندیاں چڑھاؤ پر ہوتی ہیں گورنر جنرل بہادر، تمام افراد کونسل اور عملہ کے جملہ اشخاص کے ساتھ، ہندوستان کی طرف رخ کریں گے اور تین سال تک آئندہ پرکھ (میرٹھ؟) جو قرب وجوار دہلی میں ایک شہر ہے گورنری کی فرودگاہ اور ملک کا دوسرا دارالسلطنت بنا رہے گا۔

اس صورت میں اس مرکزی عملہ کے جلو میں وہ لوگ بھی، جو اپنے مقدماتِ دادخواہی کے سلسلہ میں (یہاں، کلکتہ میں) قیام پذیر ہیں اسی قافلہ کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہوں گے مجھ میں تو نہ قیام کی سکت ہے نہ سفر کرنے کی ہمت، سفر کے ساتھ سفر خرچ بھی تو چاہیے۔وہ کہاں سے آئے۔

اے کاش نواب ذوالفقار خاں کو یہ توفیق ہوتی کہ مجھے اپنے اُمین کدہ سے ایک ہزار روپیہ اور دلوا دیتے میرے دل میں یہ بات آ رہی ہے کہ نواب والا جناب کی خدمت میں حضور والا کی معرفت ایک درخواست روانہ کروں اور اس میں اس تمام صورت حال کو پیش کر دوں۔

جناب قبلہ اُسے ملاحظہ فرمائیں مرزا رزیک جاں (مرزا مغل بیگ کے چھوٹے بھائی) کو جواُن کی قوت بازو ہیں بلائیں اور ان کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اس مقدمہ کو خوب صورتی و دُر کے ساتھ عمل میں لائے۔

موت سے پہلے واویلا کی وجہ یہ ہے کہ اس قیامت کا وقت آنے میں چار ماہ سے زیادہ مدت باقی نہیں رہی اور جس گروہ سے میری کار برآری متعلق ہے بے حد لاپرواہ واقع ہوا ہے۔

تہی دستی کے غم واندوہ میں (ایک) یہ بات بھی ہے کہ رمضان کا مہینہ سر پر آ گیا اور جو کچھ میرے پاس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اگر لارڈ صاحب سے ماہ شعبان میں ملاقات نہ ہوتی رمضان کا مہینہ خوشی خوشی گزر جاتا۔ لیکن رمضان میں کام آنے والا یہ روپیہ صاحب سکتر بہادر اور نواب گورنر جنرل کے عملہ اور کار پردازان دفتر کے انعام واکرام میں ختم ہو گیا۔

ہر چند میں نے فراخ روی وکشادہ دلی سے کام نہ لیا، لیکن سرمایہ کی قلت کی وجہ سے یہ سب ہنر مندیاں بھی بیکار گئیں، مختصر یہ کہ اتنا روپیہ تو بہر حال اس چار پانچ ماہ کی اقامت گزینی کے لیے چاہیے۔ جتنا سرمایہ آپ نے اس سے پیشتر مجھے مرحمت فرمایا تھا وہ کافی ہو جائے گا۔ امید کہ وہ جلد از جلد مجھے مرحمت فرما دیا جائے گا۔ اور جس

کے بارہ میں کسی وجہ سے تکلف و تامل ہے اس پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں من جانب روسیاہ اسد اللہ معروضہ چہارم رمضان روز سہ شنبہ۔

میرے قبلہ گاہ و حضرت ولی نعمت، مدظلہ العالی

اگر میں، اپنے منعم کا سپاس گزار ہوں تو مجھ میں طاقت کہاں اور اپنی قسمت کا شکوہ کروں تو حوصلہ کہاں سے لاؤں؟۔ سپاس اس پر کہ میں "بے کس" ہوں اور شکوہ اس پر کہ ناکس ہوں اور یہی میرا پیدائشی مقسوم ہے۔ کیا بتلاؤں کہ میں نے کس طرح اپنے ہونٹوں کو اپنے دانتوں سے کاٹا ہے اور اشکوں کی جگہ خون کے گھونٹ پیے ہیں۔

کبھی میں اپنے مخدوم کے اوقات میں تفرقہ کا سبب بن جانے کے خیال سے کرب و اضطراب کا شکار ہوتا ہوں اور شکوۂ تغافل کر کے اپنی بے حوصلگی کا ثبوت دیتا ہوں اس پر 'شکستہ خاطر' ہو جاتا ہوں۔

کبھی میں دل نوازنامے کے پہنچنے میں تاخیر کے باعث یہ خیال کرتا ہوں کہ جناب والا نے مجھے فراموش کر دیا اور اس خیال سے دل خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اس تاخیر کا باعث میرے مخدوم کی خرابیِ صحت ہے اور اس تصور سے مجھ پر ایک عالم وحشت طاری ہو جاتا ہے۔

بالآخر کہ لطف و کرم کی خوش گوار ہوا جنبش میں آئی، مجھے آمد صبح کی نوید بخشی اور میرے دل پر چھائے ہوئے پت جھڑ کے موسم کو بہار ساماں کر دیا۔

ربیع الاوّل کی ۲۹ رتاریخ تھی پنج شنبہ کا دن ایک پہر دن کا گزرا تھا کہ مولوی

صاحب میرے مکرّم مولوی ولایت حسن خاں کا آدمی پہنچا اور حضرت والا کا مکتوب گرامی اور آں محترم کا ایک نگارش نامہ مجھ تک پہنچایا۔

میں نے سب سے پہلے والا نامے کے لفافے کو کھولا اور اس کے سوادِ تحریر کو اپنی چشم منتظر کا ''سرمۂ خوش بختی'' بنایا۔ یعنی گرامی نامہ۔ کاشف حالات ہوا اور جو باتیں میرے لیے نامعلوم تھیں وہ میرے علم میں آئیں۔ معلوم ہوا کہ میرے مخدوم بصحت و عافیت ہیں اور تمام عزیز اور دوست خوش وخرم ہیں۔ اس عنایتِ ایزدی کا شکر یہ ادا کیا۔ لیکن کچھ خارجی حالات کے باعث دلِ خیر طلب قدرے غمگین ہو گیا۔

جب مولوی صاحب کی تحریر سے نگاہ آشنا ہوئی تو ایک طور پر صورت حال بدل گئی، کہ دو سو روپے کے برابر رقم کے دو قطعہ ہائے زر جناب قبلہ گاہی کے ارشاد کے بموجب ارسال کیے جا رہے ہیں۔ میں عجیب حیرت میں پڑ گیا اور طرفۂ گومگو کی صورت پیش آئی جسے وارفتگی کا عالم کہا جا سکتا ہے۔

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ میری طبیعت جناب کے احسان کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ تردّد اِس بات میں تھا کہ اگر یہ معاملہ حضرت کے ارشاد کے بموجب یا حسب الحکم ہے۔ مکتوب والا میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں ہے اور اس کی دوسری صورت تو ایک سامنے کی بات ہے۔ قرینہ ہرگز اس بات کا تقاضہ نہیں کرتا کہ یہ امر جناب والا کے حکم کے بغیر ہوا ہے۔

بالفرض اگر یہ حضور والا کے حکم کے بغیر ہے تو دو حال سے باہر نہیں، مولوی ولایت حسن صاحب میری پرورش پر مامور ہوئے ہیں یا یہ کہ جناب نے کاغذِ

زر (ہنڈوی یا نوٹ) میرے مخدوم کے پاس بھیجے ہیں لیکن پہلی شق کے اِس عنوان پر ہے کہ جو کچھ جناب والا کی طرف سے ہے وہ مجھ پر قرض ہے خواہ ادا کروں خواہ جناب ممدوح اس کو اپنی درگزر دعنایات میں داخل فرمائیں اور یہ خاکسار اس کی ذمہ داری سے فارغ خیال کیا جائے۔

دوسری شق معاملہ کو قبول کرنے کے سلسلہ میں تامل کا سبب اس امر پر نظر ہے کہ اجارہ داری کے کاروبار میں بھی ایک گونہ ابتری کی سی صورت ہے اور ملازمان حضور والا کو بہت سا نقصان برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور یہ سب امور اس ضمن میں ذہن کی پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔

اب چونکہ میں اپنی ضرورت کو زیادہ قوی اور خود کو اس معاملہ میں زیادہ درماندہ تصور کرتا ہوں، لہٰذا اس کے قبول کرنے کے ماسوا کوئی چارہ نہیں۔

اگر چہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ موجودہ حالات یا وقت کے تقاضہ کے پیشِ نظر سرکاری واجبات اور اس نوع کے پریشان کن حالات بلکہ ہنگاموں میں روپے کا بھیجنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اگر یہ روپیہ نہ بھیجا جاتا اور مجھے نہ ملتا تو میری پریشانیاں نا قابل بیان ہو جاتیں۔ میں دوستوں سے کیسے منہ چھپاتا۔ (اور کیا کرتا)

(اسد اللہ)

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی، مدظلہ العالی

یہ نیاز مند سر اقدس کے گرد طواف کرتا ہے اور اپنی جان اس قدموں کی خاک پر قربان کرنا چاہتا ہے۔ نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کہنا چاہیے کہ لفظوں کے پردے سے کیا جانے کیا بات نکلے گی، میں جانتا ہوں کہ

آپ کی یاد فرمائی پر سپاس گزاری کی کوئی حد نہیں اور اپنی قدر افزائی پر آپ کا شکریہ ادا کرنا کہ حوصلہ سے بالاتر ہے۔

تین دن ہوئے منشی عاشق علی خاں بہادر نے ایک مکتوب میرے پاس بھیجا جب اسے کھولنے کے بعد اس کے عنوان تک رسائی ہوئی تو اس تحریر کے پردے سے ایک روشنی سی چمک اٹھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ میرے خداوند کا مکتوبِ گرامی تھا۔ جو خان صاحب ممدوح کو لکھا گیا ہے اور جس میں مجھ خاکسار کے عجز و انکسار کو سراہا گیا ہے مختصر یہ کہ خط اس ننگِ آفرینش کے نام تحریر کیا گیا ہے کہ کوئی وقت مقرر کر و اور مجھے اس سے آگاہ کرو کہ میں تمہیں وہ سرفرازی بخشوں کہ تمہاری سربلندی آسمان کی حد سے گزر جائے اور اپنے آمد کی روشنی سے تمہارے ظلمت کدے کو روشن کردوں میں نے معذرت کرتے ہوئے اس کا جواب دیا اور دوسرے دن قدم بوسی کے لیے وہاں پہنچا۔

ہر چند میں نے دفتر سے آنے والا خط کا ذکر کیا جناب ممدوح کے ساتھ اپنے تعارف کو درمیان میں لایا۔ نواب علی اکبر خاں قبلہ وکعبہ کے دولت کدے پر ان سے ملاقات اور معانقہ ہو چکا تھا اس پر بھی اجنبیت کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے بعض سوالات کیے۔ جناب ممدوح نے کچھ دیر وحدت الوجود کو ماننے والوں کے مذاق کے مطابق شمع و چراغِ انجمن مولوی ولایت حسن خاں کے شیوۂ اخلاق کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ آسمانِ آشنائی کے سورج نواب علی اکبر خاں طباطبائی کی طبعِ معنیٰ شناسی کا تذکرہ آیا اور قبلہ وکعبہ کی احسان فرمانیوں کے ذکرِ خیر سے میرے دل و جاں پر مہربانیوں کی بارش کی۔ غرض کہ میں نے ان کی صحبت سے ہر طرح کا لطف و سرور حاصل کیا یہ سب

''من برکتہ البرامکہ'' .....میں سے تھا میں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے باعث مجھے اک نئی آبرو میسّر آئی اور شان تازہ ملی حق یہ ہے کہ اس دشت نوردی میں جو میری آوارہ خرامیوں کا حصہ ہے اگر میں آپ تک نہ پہنچتا تو میری خستگی اور دل شکستگی کو مرہم و مومیائی کہاں سے نصیب ہوتی۔

اگر میں انصاف کے سر رشتہ کو اپنے ہاتھ سے نہ دوں تو میر کرم علی کی شکرگزاری اور منت شناسی کے عُہدہ سے کیسے باہر آسکتا ہوں جنہوں نے اس آستانے کی خاک تک میری رہنمائی کی اور...آپ کے در دولت تک رسائی میں وہ میرے خضر راہ بن گئے۔ اب میں جناب والا کے ملازمانِ درگاہ کی کیا تعریف کروں حاشا ثم حاشا۔

خاموشی از ثنائے تو حد ثنا تست

آپ کی ثناو ستائش کی طرف سے خاموشی برتنا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی تحسین وآفرین کی آخری حد ہے، جو حال کے لائق تحریر تھا وہ اپنے عریضوں میں تحریر کر چکا اُمید کہ ان میں سے ہر ایک نظر والا سے گزرے گا ور شیوۂ تسلیم کی آئینہ داری کرے گا۔ اس جزو زماں (وقت موجود) میں سوائے اس کے اور میں کیا لکھوں کہ میرا قلم جو اجز رقم ہے صفحۂ قرطاس سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا صورتِ حال سے پردہ اٹھے بھی تو کیسے اٹھے۔

میر احمد علی خاں صاحب کے خط کا جواب اس معنی میں کہ شقۂ حضور کے ساتھ ملفوف تھا۔ بھیج دیا گیا۔ اور میرے ایک ہی آقا کے مختلف غلاموں (خواجہ تاشوں) کی عنایت سے مکتوب الیہ تک پہنچ جائے گا۔ مخفی نہ رہے کہ یہ عریضہ ماہ شعبان

کی چھ تاریخ کو چہار شنبہ کے دن تحریر ہوا۔ اسی روز میر صفات علی خاں کی معرفت لالہ کانجی مل باندوی کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ خدا انہیں مکتوب کو ہم رشتہ کرنے اور بھیجنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(اسداللہ)

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدّ ظلّہ العالی

چونکہ میرے سر میں یہ سودا سمایا ہے کہ غائب رہ کر بھی شرف حضوری سے محروم نہ رہوں تسلیمات و کورنش کی بجا آوری کے بعد عرض کرتا ہوں، کہ دو قطعۂ زر (ہنڈوی) ''شاہ جوگ'' کہ تفتیش کے بعد ہمدست ہوئے میں نے ان کو مخدومی مولوی ولایت حسن خاں کے سپرد کر دیا ان کے ملازموں کے توسط سے چالیس روز کی ''وجہ متی'' مجرا لیے جانے پر دو سو روپیہ اپنے قبضہ میں کیا اور تصرف میں لایا۔

خاطر عالی ہر طرح جمع رہے اہالی کونسل کے عزم سفر کی خبر دینے والے میرے مخدوم و مکرم منشی عاشق علی خاں بہادر ماہ شوال کی ۲۸ رتاریخ کو کہ شنبہ کا دن تھا، میرے غم کدے پر پہنچے انہوں نے اپنے نام سلام نامہ دیکھا۔

افسوس کہ جناب ممدوح نے عُہدۂ سفارت سے دست کشی اختیار کی اور ان کا استعفیٰ قبول کر لیا گیا یہی وجہ ہے کہ وہ دو ہفتے سے اہالیانِ کونسل کی بارگاہ میں نہیں آتے۔ بگمان غالب اپنے طور پر اس دیار میں ''تر دماغی'' کے ساتھ قیام فرما ہیں عہدۂ سفارت کے اوراق کا شیرازہ بکھر چکا ہے گفتگو کے دوران وہ یہ فرما رہے تھے کہ منشی محمد حسن نے دفتر سرکار میں اپنی قدر و منزلت نہ دیکھتے ہوئے دہلی کی طرف واپسی اختیار کی اور وہاں پہنچ کر اپنی پہلی خدمات پر دوبارہ فائز ہو گئے میں نے اطلاعاً یہ عرض

کردیا ہے۔

بتاریخ ۲۸/ ماہ شوال روز یکشنبہ میں میرے وکیل کا مکتوب دہلی سے پہنچا اس میں جناب ریزیڈینٹ بہادر کا نوازش نامہ جو سرکاری مہر سے مزّین ہے مجھ احقر کے نام بھی ملفوف تھا۔ اس میں ہزار گونہ تمنائیں لفظ و معنی کے سلسلوں کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔ اس خیال سے کہ اصل تحریر کو بھیجنا احتیاط کے خلاف ہے۔ مبادا کسی وقت اس کی ضرورت پیش آجائے اس بنا پر اس کی عبارت کو اس جریدے میں ہو بہو نقل کرتا ہوں (عبارت یہ ہے)

خان صاحب مہربان سلامت۔

بعد شوق ملاقات واضح ہو کہ آپ کا مہربانی نامہ جو خصوصی مطالبات کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہے دوسرے کاغذات کے ساتھ پنڈت ہیرالال کے ذریعہ موصول ہوا اور اس کے مندرجات سے آگاہی نصیب ہوئی۔

میرے مہربان اس مقدمے میں، رپورٹ صاحبانِ کونسل کے حضور میں بھیج دی گئی جب وہاں موصول ہو جائے گی تو اس کے جواب سے متعلق جناب والا کو اطلاع دی جائے گی۔ ۱۷/اپریل (۱۹۲۸ء)

مختصر یہ کہ اس دن کے آدھے حصے اور تمام رات میں یہ خوشی مجھے گھیرے رہی دوشنبہ کے دن کہ جو وکلا سے ملاقات کا دن ہے اور ہم جیسے پراگندہ حال لوگ اس روز وہاں شاذ و نادر ہی جا سکتے ہیں میں دلِ پر آرزو کے ساتھ دفتر خانہ پہنچا اہل دربار کی مجلس کے برخاست ہونے کے بعد چونکہ خداوند بارگاہ اپنے نشیمن خاص کی طرف چلے

گئے تو میں نے باریابی کی اجازت چاہی اور حاضر خدمت ہوا۔ ریزیڈینٹ بہادر کا خط ان کا نظر گاہ میں پیش کیا اس کو دیکھا اور اس سے پیشتر میں ان سے کچھ پوچھوں فرمایا کہ ہاں کول برک صاحب نے تمہارے مقدمے کے بارے میں صدر دفتر کو اطلاع دی تھی۔ یہاں سے اس کا جواب مناسب دے دیا گیا۔ خاطر عاطر میں یہ بات نہ گزرے کہ لفظ یا صواب تحریر کی خوش آبی کے باعث ہے، بلکہ یہ دفتر کے حاکمِ اعلیٰ کی زبان گوہر فشاں سے تراوش پایا ہوا کلمہ ہے۔

دوسرے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ریزیڈنٹ صاحب تمہاری طرف، نظرِ عنایت رکھتے ہیں اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ جلد ہی تمہارے دعوؤں کے بارے میں تفتیش و تحقیق عمل میں لاکر صدر میں رپورٹ بھیجیں، بات اس پر ختم ہوگئی۔ میں نے سلام کیا اور اپنی قیام گاہ کی طرف واپس آ گیا۔

کل کہ سہ شنبہ کا دن اور ماہ شوال کی ۳۰ رتاریخ تھی صبح سے دوپہر تک میں نے وکیل کے خط کا جواب لکھا اپنے وطن میں رہنے والے عزیزوں کو یاد نامے تحریر کیے حکم نامۂ حاکم کے جواب میں اپنی عرض داشت مرتب کی اور بعض پرسان حال کو خطوط لکھتا رہا۔ اسی کے ساتھ صاحب ریزیڈنٹ کے منشی کو ادائے شکر کے طور پر نگارش نامہ سپردِ قلم کیا اور آخر روز یہ سب بسبیل ڈاک روانہ کر دیا۔

چونکہ میرا ہاتھ لکھتے لکھتے بیکار ہوگیا میں جناب والا کی نظر گاہ میں بھیجا جانے التماس نامہ تحریر نہیں کر سا۔

آج کہ ماہ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ اور چہارشنبہ کا دن ہے ایک بندگی نامہ بطریقِ اظہارِ احوال روانہ کیا جا رہا ہے اب میں ماسوائے تسلیم اور کیا عرض کروں۔

عزیزوں کی خدمت میں مناسبات وواجبات پہنچے۔

(اسداللہ)

حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی

میرے سر میں یہ سودا سمایا ہے کہ میں غائب ہوتے ہوئے بھی حاضروں میں شمار ہوں۔ جو کچھ اس طرف سے ظاہر ہوتا ہے اسے میں عرض گاہ میں پہنچاتا ہوں۔ خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر کی بزم آراستہ ہوئی مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا نیز یہ کہ ملازمانِ سرکار دولت مدار کی طرف سے مجھ خاکسار کو کس طرح نوازا گیا۔

منشی عاشق علی خاں بہادر کا یہاں سے جانا اور اس کے بعد میرا ہگلی پہنچنا حضورِ والا کی خدمت میں عریضہ ارسال کرنا اور نواب صاحب کی جناب میں اپنی عرض داشت پہنچانے کا خیال۔ عطیہ کا نہ پہنچنا اور ہر طرف سے محرومی کا احساس۔

نواب گورنر جنرل بہادر کا عزمِ سفر ہندوستان اور اعیان کونسل کے رایات عالیات کا عزم سفرِ مذکور، سروسامان کے قحط کے باعث کاربراری کی تدبیریں سوچنا اور کسی طمعِ خام کا دل میں آنا متواتر عرض داشتوں میں اپنے حال وخیال کو پیش کرنے کی سعی وکاوش، کسی 'شعاعِ امید' کے چمک اٹھنے کی تمنا رکھتا، جو نا آگہی کے زنگ کو پاک وصاف کرسکے اور مجھے صورت حال کا علم ہوسکے۔ ان امور کے بارے میں آپ کو مطلع کرچکا ہوں۔

آج کہ پن شنبہ کا دن اور رمضان المبارک کی تیرہ تاریخ ہے ابھی ابھی میرے وطن کے کچھ پاشکستہ افراد کی جانب سے خط آیا ہے۔ اس ورق کے لکھنے والے

بزبان خامہ آگہی بخشنے کا ذوق نہیں رکھتے، نتیجہ یہ ہے کہ راقم سطور کے تئیں طرز مدّ عا نامعلوم ہے۔

ہاں اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ اس داد گاہ میں میرے مقدمہ کے کاغذات پیش ہو گئے اور وہاں کی عدالت کے صدر نشین نے اپنے افسروں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ وہ ان کاغذات مقدمہ سے متعلق ضروری کارروائی کریں مجھے امید ہے کہ جلد ہی میرے وکیل یا مردمان کچہری میں سے کسی کی طرف سے مجھے ضروری اطلاع نامہ مل جائے گا اور آئینہ کی طرح ''سراپائے مدّ عا'' نظر کے سامنے آجائے گا۔

حضرت قبلہ گاہی کو میں اس مقدمہ کے باب میں....اپنے سے زیادہ بلکہ زیادہ سے زیادہ توجہ فرما دیکھتا ہوں اس تحریر نامہ تحریر کو بھی میں جناب والا کی خدمت میں ارسال کروں گا۔

مخفی نہ رہے کہ ریزیڈینٹ صاحب بہادر دہلی دوم شعبان کو شہر میں واپس آچکے ہیں، اور پنجم ماہ مذکور کو میری عرض داشت ریزیڈینٹ کی بارگاہ میں پہنچ گئی۔ اور جو صحیفہ کہ مجھے ان دنوں ملا ہے۔ اپنی تاریخ نگارش کے مطابق ۲۹ رشعبان کا رقم فرمودہ ہے۔

میری ناقص رائے میں یہ بات قرین مصلحت ہے کہ جناب مخدوم ایک خط داوستانہ و مخلصانہ انداز سے منشی محمد حسن کو تحریر فرمائیں اور وہ جناب والا کو صورت حالات کی خبر دیں۔ میرا وکیل بہت ہی سست قلم واقع ہوا ہے خط کی تحریر میں بہت تاخیر کرتا ہے۔

میرا خدا جانتا ہے اور میں ایماناً یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کی نگارش مکتوب میں

یہ کاہلی بھی از راہ محبت و یکدمی ہے ورنہ میں نے اس کے خلوص خاطر کو بارہا آزمایا ہے۔ بہرحال مجھے مسرت ہے کہ میرے مقدمہ کے معاملہ میں جمود ٹوٹا آغاز کار کا مرحلہ تو پیش آیا۔ اور سلسلہ جنبانی تو ہوئی۔

میں بہرصورت یہاں عافیت سے ہوں۔ کل ایک غزل ہوگئی ہے اور چونکہ اس کے مطلع میں ایک خاص فضا کی باز آفرینی ہوئی ہے اس نیاز نامہ کے خاتمہ پر اسے لکھتا ہوں۔

لذتِ عشقم زفیض بے نوائی حاصل است

آں چناں تنگ است دست من کہ پنداری دل است

میری لذت عشق میرے ''فیض بے نوائی'' کا نتیجہ اور مری سعیِ الا حاصل کا حاصل ہے، میرا ہاتھ تو اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ وہ اب میرا ہاتھ نہیں لگتا کوئی اسے دیکھے تو یہ کہے کہ وہ میرا دل ہے۔

میری چچی کا خط جو دہلی سے پہنچا ہے وہ بھی اس عریضہ کے ساتھ ملفوف ہے اسے پڑھ کر چاک کر دیں یا جلا دیں۔

فقط اسد اللہ

قبلہ گاہی

زمانہ گزر گیا قرن بیت گئے کہ والا نامہ کے سواد روشن سے چشم منتظر نے نور نہیں پایا

(روشن نہیں ہوئی) اور نسیم لطف نے اپنے لمس سے شام جاں کو عطر بیز نہیں کیا۔ اس اثناء میں دو عرض داشتیں، ایک مجملاً دوسری مفصّل طور پر کہ دہلی کے واقعات کی طرز و روش کا بیان اپنی جیب و آستین میں رکھتی تھیں مجھ تک پہنچیں، کیسے کہوں کہ میں نے ان کو کس طرح کھولا اور کیسے پڑھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ حضرت والا نے جواب تحریر نہیں فرمایا۔ بہرصورت انہیں ''حالات'' میں کہ روح پیچ و تاب کی بوقلمونیوں اور دل و دماغ پریشانیوں اور پرفشانیوں کی کشمکش میں گھرے ہوئے تھے۔ پتوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور صبر کی کشتی کا لنگر ٹوٹ گیا تھا۔

میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ سعادتوں خوش بختیوں اور کرامتوں کی عنصری ترکیب یعنی ربوبیت نامہ کا دیر سے پہنچنا مجھے سخت تشویش و تفکر میں مبتلا کر دیتا ہے ورنہ ہم ''کشتگانِ خنجر تسلیم'' کے لبوں پر حرف شکایت کہاں آتا ہے۔

میری فکرِ فضول کی اندیشہ ناکیوں کا ایک تقاضہ یہ بھی تھا اور ہے کہ اس خیر طلب کی نگرانی خاطر کی خبر حضرت والا کے دل کی لوحِ محفوظ پر مرتسم ہو جائے اسی کے ساتھ میں نظر گاہِ عالی میں اپنے تارِ دل کا اندوہ گیں نغمہ پیش کر سکوں۔

خداوندانِ کلکتہ کے حالات یہ ہیں کہ اب سے کچھ پہلے ولیم بیلی صاحب جو مجلس نظما کے سب سے بلند و بالا مرتبہ کے رکن یعنی گورنر جنرل (بہادر) تھے وہ تو برہما چلے گئے ان کی جگہ پر لارڈ ولیم بینگ گورنر جنرل ہوئے سیر و شکار کے ارادہ سے کلکتہ سے باہر ہگلی گئے ہیں کہ ایک شکارگاہ ہے شاید آج واپس آ جائیں۔ ولیم بیلی

صاحب۔ اچانک کلکتہ پہنچے ہیں۔ ایک معتبر آدمی کا بیان یہ ہے کہ یہ سب دفعتاً ہوا ہے۔

دوسرے راجہ ادت نرائن سنگھ راجۂ بنارس اپنے والد اور وابستگان دولت کے ساتھ اس معمورہ آباد میں وارد ہیں ان کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ جگناتھ کی یاترا کو جا رہے ہیں مگر یہ تو افواہ عوام کی بات ہے حقیقت یہ ہے کہ ملازمان سرکار یا نظمائے کونسل نے آئندہ کے واسطے بنارس کے راجہ صاحب کے بارہ میں کوئی ایسا نیا قانون یا دستور عمل بنایا ہے جس کی رو سے راجہ کا اختیار و اقتدار باقی نہیں رہے گا راجہ اسی کی چارہ جوئی اور اسی کے خلاف فریاد گزاری کے عندیہ کو لے کر یہاں آئے ہیں کہ ان کی مرزبانی و حکم رانی کا بھرم رہ جائے مگر ایسی کوئی توقع نہیں کہ یہ فرمان واپس لے لیا جائے اور یہ صورت حال دگرگوں نہ ہو۔

دیگر یہ کہ سننے میں آ رہا ہے کہ ماہ اگست میں موکب گورنری آں سوے ہندوستان (دہلی) کا رخ کرے گا اور اسی کے ساتھ دفتر خانے اور عملے کے بہت سے آدمی بھی سفر کریں گے اور وکلا، سفیر، اہل داد غرض کہ سب فریاد گزار اور ان سے متعلق افراد اُن کے پیچھے رہ سپار ہوں گے۔

یہ ان دادخواہوں کے لیے بطور خاص ایک گونہ خوش خبری ہے کہ دہلی ریزیڈینسی اور ریجنٹی کی لکد کوب سے اب ان کو نجات مل جائے گی۔ خاص طور سے ان لوگوں کو جو تلوار کی دھار پر سینہ کے بل سفر کرتے اور دشت و دریا سے گزرتے ہوئے بھاگتے دوڑتے ان کے پیچھے چل رہے ہوں گے۔ ایک شردہ ہے۔

غالب شوریدہ قسمت کی غربت زدگی کے خبر ناموں میں سے ایک خبر یہ بھی

ہے کہ یہ سننے میں آرہا ہے کہ ریزیڈینٹ دہلی ماہ جنوری کے آخری ایام اس شہر کی طرف واپس آجائیں گے توقع کی جاتی تھی جنوری کے اخیر میں نہیں تو فروری کے ابتدائی دِنوں میں ان کی واپسی ہوجائے گی۔ اب کہ وہ دن بھی گزر گئے اور یہ دن بھی لامحالہ یہ انگریز حاکم دہلی پہنچ چکا ہوگا میرا مقدمہ بھی اس اثناء میں پیش ہوجانا چاہیے اب مجھے دیکھنا ہے کہ ان چار پانچ مہینے میں کیا پیش آتا ہے۔

مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ بہ مقتضائے ''قضیۂ زمین برزمین'' اس نوع کے مقدمات میں حکم آخرانہیں مقامات میں سامنے آئے گا جن سے وہ مقدمات متعلق ہیں اور ہر بقعۂ زمین کے حکام کی کارنمائی کے لیے کوئی گنجایش باقی نہ رہے گی۔ مجھے صاحب سکتر بہادر نے بر سبیل تفاول بتلایا تھا، کہ اب تم لوگ ریزیڈینٹ دہلی کی کم فہمیوں پرافسوس کرنے سے بچ جاؤ گے۔

جناب گورنر جنرل بہادر خود ہر مقدمہ کی صحیح صورت حال پر غور فرمائیں گے۔ اور معاملہ کی تہہ تک پہنچیں گے۔ ستم رانیوں کا خاتمہ ہوگا واد بیداد کے سلسلے ٹوٹ جائیں گے۔ اور ناانصافیوں کے حلقے بکھر جائیں گے۔

اس شہر کے حالات میں سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مخدومی ومکرمی مولوی ولایت حسن بہ سبیل دورہ یہاں پہنچے اور تین چار دن یہاں قیام فرما کر واپس ہوگئے ظاہر ہے کہ ایسی ہی کوئی مجبوری رہی ہوگی ورنہ یہ تو نہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ غالب کے غم کدہ کی طرف ذرا سی دیر کے لیے بھی قدم رنجہ نہ فرمائیں۔

.....اور میرے ظلمت کدے کو اپنے وجود کے پرتو سے فروغ نہ بخشیں، اور مجھے تو خبر بھی ان کے رخصت جانے کے بعد ملی ورنہ ممکن نہ تھا کہ میں سر کے بل چل کر

وہاں پہنچوں اور مجھے ان کا در نہ ملے۔

ان سوانح اور وقایع کا تذکرہ عنصر سخن کی سیرابی و شادابی میں کام آ سکتا ہے اور تحریر کی گراں مایگی کا باعث بن سکتا ہے۔ اسے میرے محسن حقیقی نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی مدظلہ العالی کے اخلاق عالیہ اور اوصاف حمیدہ کا "ذکر خیر" کہنا چاہیے۔

قسم بہ خداوند سوگندِ ایزد دانا کہ جس عقل کو پیدا اور علم کو برگزیدگی بخشی کہ اس گراں مائگی و بلند نگاہی کے ساتھ میں نے کلکتہ میں کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔ جب میں اس ستودہ صفات شخص کی خوبیوں کے بارہ میں سوچتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ یہ گوہر گرامی آخر کس سمندر کی تہہ سے نکلا ہے اور یہ برگزیدہ اعمال انسان کس دودمان عالی سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ جس شفقت و مرحمت سے پیش آتے ہیں میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں ان کی تحسین کرسکوں۔ جب ہگلی سے یہاں کلکتہ رونق افروز ہوتے ہیں تو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ میرے غربت کدہ کو وہ اپنی ذات عالی صفات کے پرتو سے منور نہ فرماتے ہوں اور مجھے سرفرازی نہ بخشتے ہوں۔

اس شہر کے لوگ از راہِ حسد مجھ سے معارض ہوئے نواب صاحب موصوف ان ادبی مباحثہ میں میرے طرف دار و مددگار رہے اب ان کی چھوٹی دختر کی تقریب (شادی) ہے مجھ سے فرمایا کہ ہماری دعوت پر جب تم ہگلی آؤ گے تو ہمارے ساتھ دو مہینے ٹھیرو گے، میں اپنے طلب نامہ کا منتظر ہوں۔

گمان غالب ہے کہ ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ورنہ رقعہ آ چکا ہوتا۔ نواب صاحب ممدوح کے وہ رقعے جو انہوں نے مجھے لکھے ہیں وہ اس خط کے ساتھ ہم نورد

کر کے بھیج رہا ہوں تا کہ وہ ملازمان والا کی نظر سے بھی گزر جائیں اور میرے حال پر نواب صاحب ممدوح کی نگاہِ لطف کی آئینہ داری کریں۔ والسلام

قبلہ گاہ، اور ہم بے کسوں کے لیے پناہ گاہ

بندگان والا پر روشن رہے۔ حضرتِ والا دو مہینے اور ان پر دو روز اور بیت گئے کہ والا نامے کے سواد سے چشم منتظر نے نور نہیں پایا جو عریضہ میں نے ماہِ مذکور کی ۸ تاریخ کو لکھا تھا اسے اپنے مخدوم مولوی ولایت حسن کے خط کے ساتھ ملفوف کر کے روانہ کیا تھا۔ ابھی تک آپ کا اس ضمن میں کوئی کرم نامہ نہیں آیا شاید کوئی خط نظر کیمیا اثر سے نہیں گزرا۔ کاش میں اس کا گمان آں مخدوم کے طرزِ تغافل پہ رکھ سکتا تو طرح طرح کے اوہام کی یورش شوریدہ سری دل میں گونا گوں خدشات پیدا کرنے والے افکار سے طبیعت تسکین پاتی اس دیار غیر میں بھوکا ننگا ہو کر کیسے وقت گزارتا۔

مخفی نہ رہے کہ جب تک میں سفر و اقامت کے مابین کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا اس وقت تک میں نے سواری کے گھوڑے کو اپنے سے جدا نہیں کیا تھا لیکن جب یہ دیکھا کہ مجھے ایک خاصی لمبی مدت تک کلکتہ ہی میں رہ کر خاک بیزی کرنا ہے اس کے لیے روپیہ بھی چاہیے اور فرصت کے لمحات بھی جس میں جانور (گھوڑے) کی خدمت کی جا سکے تو میں نے اپنے اسپِ راہوار کو فروخت کر دیا۔

اس کی قیمت فروخت کے طور پر مجھے ایک سو پچاس روپے ملے۔ سائیس کو بھی میں نے رخصت کیا اور خدمت گار کو بھی جواب دے دیا۔ تین نوکر اور ایک کہار اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ اور میں اگر میری سوچ غلط نہیں تو ''آدھا آدمی تو'' میں خود بھی

ہوں کہ دوسرے انسان چاہے وہ کتنے ہی کم درجہ کے ہوں رات دن میں دو بار تو اپنے تنور شکم کو ضرور خوراک کے ایندھن سے بھرتے ہیں۔اور میں ایک وقت کھاتا ہوں۔

سواری کا گھوڑا بیچنے کے بعد پچاس روپے صرف ہو گئے تھے اور سو روپے باقی تھے کہ منشور سعادت پہنچا اور میرے اندوہ خاطر کو فکر و تردّد کی گرد سے پاک کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جاڑا اور پر سے آرہا ہے.....گرم کپڑے اور ایک کمبل تو چاہیے جناب والا کی بروقت دستگیری نے اس تردّد سے نجات دی اور پریشانی واضطراب کو دور کیا۔

اب گھوڑے کی قیمت کے سو روپے جاڑے کے ساز و سامان اور ربیع الثانی کے چار ہفتے کی مدت بسر کرنے میں صرف ہوں گے اور دو سو روپے جمادی الاوّل کی پہلی تاریخ سے رمضان المبارک کی چاند رات تک کے خرچ اخراجات کے لیے کافی سمجھیے کہ میں نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا ہے کہ میں پچاس روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کروں گا۔

توقع یہ ہے کہ ان پانچ ماہ میں کشود کار کی کوئی صورت سامنے آجائے گی۔ اور مقدمہ کا کوئی فیصلہ ہوجائے گا۔مقدمہ کے دوران سرکار سے بھی قرض لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

خداوندِ من۔آج چالیس اور دو بیالیس دن گزر گئے کہ میرے مقدمہ کے کاغذات دہلی روانہ کیے گئے تھے ابھی وہاں سے کوئی جواب ہی نہیں آیا کہ میں اس بارے میں کوئی خبر دے سکوں۔اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ میرے کاغذات وہاں پہنچے یا نہیں ویسے اس نوع کی ڈاک تلف نہیں ہوتی یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مکتوب الیہ نے

ازراہِ تغافل کوئی جواب نہیں دیا کہ وہ تو میرے مخصلوں اور ہمدردوں میں سے ہیں۔

میرا وکیل اس فکر میں ہوگا کہ دفتری کارروائی ہوجائے اور کوئی صورت بنتی نظر آئے تو وہ مجھے مطلع کرے اور صورت حال سے آگاہی بخشے۔ امید کہ مجھے عرضداشت ہذا کے جواب سے ضرور سرفراز فرمائیں گے۔ اور میری لاعلمی اور مجہولیت کو علم سے بدل دیں گے۔

اسی کے ساتھ ایک خط میر کرم علی کے نام بھی اس میں ملفوف ہے۔ ازراہ کرم میر صاحب موصوف کو یاد فرمائیں اور مکتوب کا مفہوم اس طرح ان کے گوش گزار کریں کہ اس کا حرف، حرف الہام کی طرح دل نشین وخاطرنشان ہوجائے اور ان کے جواب کو اپنی طرف سے بھیجے جانے والے خط کے ساتھ ملفوف کردیں اور روانہ فرمادیں۔

سب بھائیوں اور عزیزوں کو سلام و دعا اور اخلاص و اختصاص کی ڈالیاں قبول ہوں۔

بہ خدائے لایزال کہ عبودیت ناموں کی تحریر کے وقت ذوق حضوری میں اضطرار و اضطراب کے عالم میں مولوی ولایت حسن کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ ان کے گرامی نامے کا بھی جواب آیا ہے یا نہیں اس کے بارے میں معلومات کیں۔ پتہ چلا کہ وہ بھی میری ہی طرح آنے والے خط کے انتظار میں ہیں اور نامہ بر کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

جنابِ والا کے حالات کا علم نہ ہوسکا اگر کچھ معلوم ہوجائے تو میری ذہنی پریشانیاں دور ہوجاتیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے رشک کے عذاب میں مبتلا نہیں ہونا

پڑا کہ جس کی آگ مجھے جلا کر راکھ کر دیتی۔

سخن کوتاہ جہاں جہاں سے جو کچھ معلومات ہو سکیں اور اس اثناء میں جو صورتِ حال پیش آئی اس کا بیورا حضرتِ والا کو میں اپنے دو خطوں میں دے چکا ہوں اور اس طرح تمام ضروری تفصیل حضرتِ والا کی رائے روشن کے لیے پیش کر دی گئی اس وقت تک میری کوشش و کاوش کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ بس اس قدر ہے کہ میری عرض داشت کونسل میں پیش ہو گئی ہے لیکن ہنوز اس کا کوئی جواب مجھے نہیں ملا اور تازہ بات صرف یہ ہے اور اسے خدا کی بہترین عنایات میں شمار کیا جانا چاہیے کہ صاحبان کونسل نے میری عرض داشت کو قبول کر لیا مگر اب یہ کہ ضابطے کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے داد فریاد ریزینٹ دہلی کے گوش سماعت تک پہنچے یعنی اس مقدمے کو وہاں پیش ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ میرے پاس سفر کے لیے سروسامان ہے اور نہ واپسی کی تاب و تواں، تو حکم ہوا کہ تم یہاں ٹھہرو اور اپنے وکیل کے ذریعے سے ریزیڈینسی دہلی میں اپنا مقدمہ پیش کرو۔

مجبوراً میں نے دہلی کے دوستوں میں سے ایک دوست کو خط لکھا اور اس سے اعانت کا طلب گار ہوا اس نے بے کسی نوازی کی اور پیش رفت کی غرض سے ایک وکیل مقرر کر دیا اور مجھے اس کی اطلاع دیدی فی الوقت میں نے مختار نامہ اس کے نام لکھ دیا ہے اور جس جس طرح کے کاغذات کی اس سلسلے میں ہم رشتگی ضروری تھی انہیں بھی اپنی درخواست کا ضمیمہ بنا کر اس کارفرما کی خدمت میں روانہ کر دیا، جو مجھ پر بہت مہربان ہے اور امورِ دادخواہی کے معاملات میں مجھ سے زیادہ نزاکتوں کو جانتا ہے۔ یہ سب کاغذات میں نے بذریعہ ڈاک شاہجہاں آباد دہلی بھیج دیئے۔ اب جو بھی خدا

کی مرضی ہو میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

اسبابِ ظاہری پر نظر کی جائے جس سے اہل دانش و بینش حالات کا اندازہ لگاتے ہیں اور ناقص نگاہ لوگ ان کے گرد مکڑی کی طرح جال بنانا شروع کردیتے ہیں۔ جو بھی صورت ہو میں ایک بہتر انجام کی توقع رکھتا ہوں۔ اور دو دلچسپ لطیفے یا معنی خیز نکتے اس میں ہیں۔

ایک یہ کہ دارالخلافہ (دہلی) سے ایک قابلِ اعتماد شخص کی یہ تحریر آئی ہے کہ نواب احمد بخش خان کا جو بیٹا اپنے باپ کی جگہ ریاست میں گدی نشین ہوا ہے، وہ آزاد مزاج اور رندانہ وضع رکھنے والا شخص ہے اس کی ''شوریدگی وضع'' اس کے اہلِ قوم کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے اور شہر کے لوگ بھی اس سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے مجھے اس خیال سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ کلکتے کے اُمراء میں سے ایک صاحب نے جو بلند رتبہ شخص ہیں، مسٹر کال بروک کے نام ایک تحریر بھیجی تھی۔ اور یہ تحریر دوسری تحریرات کے ساتھ دہلی پہنچ گئی ہے۔ میری تشنگی کا سبب صرف اتنا ہے کہ مجھے منشی التفات حسین صاحب، کا جو کال بروک کے منشی ہیں اس شہر میں کوئی دوست نہ ملا۔

مخفی نہ رہے کہ منشی التفات حسین خاں مولوی عزیز اللہ نام کے ایک بزرگ کا بیٹا ہے اگر احیاناً وہ جنابِ والا کا آشنا ہو تو ایک مکتوب اس کے نام سے تحریر فرمایا جائے اور مجھے یہاں بھیجنے کے بجائے کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں اسے دہلی روانہ کردیا جائے اس مکتوب کا مضمون یہ ہونا چاہیے کہ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کا مقدمہ جو پنڈت ہیرا لال کی معرفت دہلی کی کچہری ریزیڈینسی میں یہاں سے بھیجا گیا ہے وہ دراصل میرا اپنا مقدمہ ہے اور اگر حضرت قبلہ گاہ التفات حسین خاں سے آشنا نہ ہوں تو

جناب حکیم سلامت علی خاں صاحب سے اس کے نام لکھوا دیں اور شاہجہاں آباد روانہ فرمادیں۔

لیکن یہ خط خدا کے لیے میرے پاس نہ بھیجئے کہ اس کا یہاں سے پھر شاہ جہاں آباد روانہ کرنا تاخیر کا سبب ہوگا اور مہلت طلب۔ میں تو صرف اس کی اطلاع چاہتا ہوں کہ حضرت والا کی جانب سے مطلوبہ خط دہلی روانہ کر دیا گیا۔

بار بار دل میں یہ بات آتی ہے کہ میں اپنے حالات کے بارے میں بھی، جس میں بہت سے رخنے پڑے ہوئے ہیں، کچھ لکھوں۔ لیکن یہ سوچ کر میرے عریضۂ سابق میں بھی میرے حالات کا کچھ حصہ مرقوم تھا اس کا کوئی جواب مجھے نہیں ملا جب کہ دوسرے عریضوں کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ بہر کیف جواب مجھے بھیجا گیا ہو یا نہ بھیجا گیا ہو اس سے قطع نظر کر کے اس صحیفے میں جوہرِ آئینہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مدعا بہر حال ایک ہی ہے لیکن وہ خط جو مرزا امیر بیگ، نواب ذوالفقار الدولہ بہادر کے خالو کے نام تھا اسی کشادہ عنوان کے ساتھ میرے عرضی نامے کے ساتھ ملفوف ہے۔ امید کہ شروع سے آخر تک اس کو پڑھ کر اور اس کے مطالب سے آگاہ ہو کر اسے مکتوب الیہ تک پہنچا دیا جائے گا۔ سوائے عرضِ نیاز کے اور کیا کہوں۔

محمد اسد اللہ

بے کسوں کی پناہ گاہ اور ارادت مندوں کے قبلہ گاہ

صبح ہنگامہ آرائی اور دوپہر خامہ فرسائی میں گزر گئی لیکن افسوس کہ میری آنکھیں اس کفِ پا کی روشناس نہ ہوئیں اب شام کے لیے نواب صاحب کی بساط

بوسی اور شب کے واسطے اپنے سے وعدۂ جرعہ نوشی۔ یعنی دہانِ زخم کو اس نمک سے تر کرنے کا خیال جسے عرف عام میں آتش سیّال کہا جاتا ہے) صبح اگر بسترِ خواب سے زندہ اٹھ سکا تو حضرت کی قدم بوسی کی مسرت حاصل کروں گا۔

مکتوب موعود پہنچ رہا ہے میں نے اسے "پرِ پروانہ" کی سی شکل دے دی ہے چونکہ میرا آدمی ڈاک گھر کے طور طریقوں سے واقف نہیں امید کہ آپ اس پر ایک نظر ڈال کر، اپنا کوئی آدمی اس نامہ بر کے ساتھ کر دیں گے تاکہ خط ڈاک خانے تک پہنچ جائے اور مقررہ محصول ادا کر کے صحیفہ بردار اس کی رسید حاصل کرے۔

زیادہ تسلیم و نیاز۔

اسداللہ

اعلیٰ حضرت، نواب صاحب قبلہ کونین و کعبۂ دارین (مدظلہ العالی)

اس وقت کہ میری جبینِ نیاز آستاں بوسی کی آرزو میں سجدہ ریز اور میری ہر سانس، ذوق سپاس گزاری میں زمزمہ سنج ہے۔ آپ کی غم خواری و مسافر نوازی کا احساس روح کو تازگی فرحت اور توانائی بخش رہا ہے، خدمت والا میں عرض پرداز ہوں کہ میں یکم جمادی الاول کو جمعہ کا دن تھا باندا پہنچ گیا اور اسی روز نامہ عالی کے پرتو سے آنکھیں روشن اور دل پر مراد شادماں ہوا۔

اس یگانہ داور کی بارگاہ میں کہ جس نے جاں و جہاں کو پیدا کیا ہے وقت صبحِ شکر روانہ کیا۔

قبلہ گاہ من

عرض تسلیمات و آدابِ کورنش کے بعد جو باتیں مجھے عرض کرنا ہیں ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ایک اچھا خاصہ لمبا زمانہ بیت گیا کہ والا نامہ جسے 'بال ہما' کہنا چاہیے، میرے سر پر سایہ فگن نہیں ہوا۔ جب سے میں کلکتہ آیا ہوں، میں اس کا خوگر ہو گیا ہوں، کہ ہر ماہ میں دو بار نامۂ عنبریں شمامہ کے سوادِ تحریر سے میری آنکھیں روشن اور میرا دل خوش ہو۔

اب اگر دو ماہ تک بھی آپ کا کرمنامہ نہ آئے تو دامن صبر میرے ہاتھوں سے کیوں نہ چھوٹ جائے اور میں انتظار کے جال میں کیوں نہ تڑپوں خاص طور پر ان حالات میں کہ مزاج مبارک کی طرف سے طبیعت متفکر اور نوید خیر و عافیت کی منتظر ہو۔ دوسرے یہ کہ سرکاری اجارہ داری اور محصولات کے سلسلہ میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا خیال مزاج خیر طلب کو مزید متوحش و مشوش بنا رہا ہو تو کیا کیا جائے، امید کہ راحت نامہ تحریر کر کے میرے سوادِ خاطر سے غبارِ اندوہ کو دور فرما دیں گے اور میرے دل وحشت زدہ کو پھر سے سکون و طمانیت نصیب ہو اور بوئے رمیدہ کی طرح میری پریشان طبیعت، امن آبادِ عافیت میں پہنچ جائے یہاں کے حالات سے متعلق جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

دہلی سے جو خط آیا ہے اس سے اِس مدّعا کا اظہار ہوتا ہے کہ میرے کاغذات دہلی پہنچ گئے ہیں اور میرے کارفرما دوست تک اُن کی رسائی ہو گئی ہے۔

چونکہ عام طبعتیں بالذات خودنمائی اور خودستائی کو پسند کرتی ہیں بنا بریں اربابِ انجمن کو یہ بات ناگوار گزری اور اس محفل شعر و سخن کے اکابر اور بلند رتبہ اہلِ

ادب ۔نے اس پر حسد کو کام فرمایا اور مری غزل کے دو شعروں پر انہوں نے اعتراضات کیے جو نادرست تھے۔

شہر کے بعض نااہلوں نے ان اعتراضات کو شہرت دی اس کا جواب یا صواب پا کر خاموشی کے زانو پر اپنا سر رکھ دیا۔ مخدومی و مکرمی نوّاب علی اکبر خاں اس داوری میں مرے ہمزبان و ہم خیال رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کی جاہ مندی کو ہمیشہ قائم رکھے۔ شورش برپا کرنے والوں کو انہوں نے حسنِ ادا سے خاموش کرایا۔

چنانچہ فقیر نے اظہار نیاز مندی و عجز کے طور پر ایک مثنوی تحریر کی اور اس میں ان کے اعتراضات کا بھی جواب دیا اُسے آپ کی نگاہ والا سے بھی گزرنا چاہیئے انشاءاللہ جو عرضیہ جلدی ہی ارسال کروں گا اس میں اس کی نقل بھی ہم نورد ہوگی۔

ایک ملفوف بے لفافہ میر کرم علی صاحب کی خدمت میں بھی روانہ کیا جارہا ہے امید کہ میرے خواجہ تاشوں کی مہربانی اور ملازمانِ بارگاہ کی توجہ سے یہ ان تک پہنچ جائے گا اس سے زیادہ کیا پیش کروں۔

محمد اسد اللہ

معروضہ چہارم رجب۔

بنام مرزا احمد بیگ تپاں

مرزا احمد بیگ صاحب تپاں کی نظر گاہ میں (جن کی ذات گرامی فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے اللہ پاک، ان کے سایے کو ہم نیاز مندوں کے سروں پر قایم رکھے

عرض خدمت ہے کہ اس نیاز مند کا جو مکتوب مولوی سراج الدین احمد کے نام ہے اور اس نیاز نامہ کے ساتھ ہم نورد کر کے روانۂ خدمت کیا جا رہا ہے۔ دعوت شادی کا ایک رقعہ اپنی طرف سے تحریر کر کے اسے مرزا اکبر بیگ کے نام ارسال فرمادیں۔ یعنی میرے آدمی کو دیدیں کہ وہ اس لفافے کو مہدی باغ پہنچادے۔

جو کہار بندگی نامہ کے پہنچانے پر مامور کیا گیا ہے، وہ عقل کے اعتبار سے بالکل ہی پیدل ہے۔ جس سے میں نے یہ سمجھ لیا کہ تمام کوشش کے باوجود مدعاے دلی

حسبِ خواہش پورا نہ ہوگا، جو خطوط مولوی سراج الدین احمد کے نام لکھے گئے ہیں ان کو اپنے عرض نامہ کے ساتھ ہم رشتہ کر کے روانہ کر رہا ہوں اس کی تفصیل بزبان قلم گوش گزار کر دی گئی ہے۔ مولوی سراج الدین احمد کے نام خط اس لیے ملفوف کیا گیا ہے کہ کہار مرزا اکبر بیگ کا گھر نہیں جانتا۔ فقط اسد اللہ

نوازش فرمائے من: سلامت

والا نامہ پہنچا کاشفِ حالات ہوا۔ میں نہیں چاہتا کہ عین محفل میں یہ رسم ادا ہو۔ میں نے اپنے شہر میں کہیں دیکھا بھی نہیں تھا، کہ بسم اللہ کی رسم ادا کرنے کے موقعہ پر محفل میں شریک عزیز اور رشتہ دار بچے کو روپے دیتے ہوں۔ ہاں ختنوں کی تقریب میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔

بسم اللہ کی تقریب کے موقعہ پر میں نے اپنے یہاں دو رسمیں ادا ہوتی دیکھیں ہیں ایک یہ کہ جو مکتب کا مُلّا بچہ کو سورۂ اقراء پڑھاتا ہے اس کو بچہ کے قریبی عزیز رشتے دار بطور نذر کچھ دیتے ہیں دوسرے یہ کہ میوے کے خوان یا روپے بھیجے جاتے ہیں۔

چونکہ مُلّا کو بطور نذر کچھ دینے کی رسم میرے شہر میں نہیں ہے اب اُسے کیسے انجام دیا جانا ممکن ہے میوے اور نبات کے خوان برادری والوں کو بھیجنے کی رسم ہے یہاں میں سینی وطباق جیسے برتن یا ظروف کہاں سے لاؤں کہ میں تو مسافر راہ ہوں۔ موجودہ صورت حال میں کچھ نقدی بطور نذرانۂ مسرت پیش کی جاسکتی ہے۔ یہی میرا دل گواہی دیتا ہے۔ اس بارۂ خاص میں جناب والا کی طرف سے کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔

اشخاص معلومہ کی طلب فرمائی اگر خاطر عاطر کو منظور نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اس نیاز مند کو اس میں کوئی اصرار بھی نہیں میں نے تو از راہ مصلحت ایسا سوچا تھا۔ اگر مناسب تصور فرمائیں تو جو عریضہ میں نے صبح خان صاحب کے واسطہ سے بھیجا ہے اسے اپنے آدمی کے ذریعے میرے مخدوم مولوی سراج الدین احمد تک پہنچا دیں۔

نیز میری طرف سے ایک رقعہ لکھ دیں کہ مجھ سے اسد اللہ خاں نے یہ خواہش کی ہے۔ دیکھیں مولوی صاحب موصوف کیا فرماتے ہیں مگر یہ سب آپ کی راے عالی پر موقوف ہے۔ میری مرضی بہر حال وہی ہے جو آپ کی رضا ہے۔

بہ جناب رافت مآب مخدومی مرزا احمد بیگ صاحب

اللہ پاک ان کے سایۂ عاطفت کو دیر تک قایم رکھے۔ آمین

میرے مخدوم۔ کے نورِ چشم محمد علی خاں کی شادی والی رات میں کچھ ایسا ہوا کہ جب آدھی رات گزر گئی تو میں اپنے غربت کدہ پر لوٹ آیا چونکہ میں خود کو مہمان نہیں سمجھتا تھا اور تکلف کا پردہ درمیاں میں نہ تھا، میں دولت خانۂ عالی کی طرف متوجہ ہوا اور بے خبری کے عالم میں گھر پہنچ گیا مخدومی ابوالقاسم خاں اس سے باخبر ہیں۔ قصہ مختصر رات کے دو پہر، غنودگی کے عالم میں بسر ہو، میں قریب صبح بیدار اور ہگلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو دن رات وہاں آرام کیا، دوشنبہ کے دن آخر روز واپس ہوا۔ مخدومی نواب علی اکبر خاں نے سلام کہا ہے۔ اور مبارکباد پہنچائی ہے۔ میرے شوق آوارگی کے خبر نامے یہ تھے جن کو میں نے پیش کر دیا ہے۔

میں امیدوار ہوں کہ جناب والا اپنی صحت وعافیت مزاج نیز صاحب زادوں کی خیریت وخوشی سے مجھے آگاہی بخشیں گے۔ اب تحریر ونگارش کے لیے عرضِ

نیاز کے سوا اور کیا باقی رہا ہے۔

اسد اللہ

مخدومی

نوازش نامے نے شرف صدوریت بخشا اور میری خاکساری کی آبرو کو بڑھایا تینوں مطلعوں کو ''ارواح ثلاثہ'' کی طرح میں نے دعوے کی دلیل بنا دیا احتیاط سے انہیں بطور نگہداشت رکھ دیا میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ چند روز صبر کیا جائے اور محفل مشاعرہ میں انہیں بہ آواز بلند پیش کیا جائے تا کہ اعتراض کرنے والے کی رسوائی اور جس پر اعتراض کیا گیا ہے اس کے فکر کی بلندی اور خوبی سب پر آشکارا ہو جائے۔

علاوہ بریں جناب والا کی عنایت بے نہایت اور مرزا ابوالقاسم جیسے محترم و مکرم شخص کی یاد آوری کے بارے میں کیا عرض کروں کہ وہ میرے دست و دل کے حوصلہ سے کہیں زیادہ ہے۔۔ مجبوراً میں نے اس کو اپنے دل و جان کے حوالے کر دیا ہے۔ آداب و تسلیم اور عرضِ سپاس کو اس فقیر حق شناس کی طرف سے انکی خدمت والا میں پیش کر دیا جائے۔

(اسد اللہ)

.....

قبلۂ من!

اب میں نہیں جانتا کہ یہ میری سادہ لوحی کی وجہ سے ہے یا پھر واقع ہی کچھ اس طرح ہے کہ جناب والا کے ملازموں اور خدمت گاروں کو میں اپنے ملازم اور

خدمت گار تصور کرتا ہوں۔ تین دن ہو گئے کہ میرا آدمی جاتا ہے اور ''جانو'' کو تاکید کرتا ہے اور ہر روز شام تک میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔ نیچے ٹوٹ پھوٹ گئے میرے پاس آدمی کہاں کہ میرا کام وہ سرانجام دے۔ میرے پاس ایک کہار اور دو خدمت گار ہیں۔ جو نہ اس شہر کو جانتے ہیں نہ شہر والوں کو۔ کتنے افسوس کی بات ہے اگر آپ بھی اس غموں سے بھرے زمانے میں میری تنہائی اور بے کسی کے ہمدرد اور غم گسار نہ بنیں۔

میں نے مانا کہ ''جانو'' یہ عذر کر آیا ہے کہ اس کو کہیں کوئی نیچہ بند نہیں ملا مجھے نیچہ بند درکار نہیں ہے۔ جانو سے فرمایئے کہ وہ یہ دردِ سر برداشت کرے اور میرے پاس آئے۔ تاکہ دونوں نیچے میں اس کو سپرد کر دوں۔

اور جس طریقہ پر مجھے انکی دُرستی منظور ہے وہ اسے سمجھا دوں۔ تاکہ میرا کام تو چل جائے اس وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہا ہوں۔ اگر وقت نے ساتھ دیا میں رات کے ابتدائی حصہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ بہر حال کل سویرے اگر ممکن ہو تو ''جانو'' میرے پاس آجائے زیادہ حدِ ادب۔

اسد اللہ

.....

(میرے مخدوم و مطاع)

سرکارِ والا کے خدمت گاروں کی بے پرواہی کا شکوہ اس سے کہیں زیادہ ہے کہ تحریر میں آئے اور تقریر میں سمائے۔ ناچار میں نے نیچہ بند کو جانو کے اور جانو کو خدا کے سپرد کیا۔

سب سے پہلے نورِ چشم محمد علی خاں کی (اللہ پاک ان کی عمر بڑھائے) خیر

وعافیت بھیجئے کہ میری خاطر کو آرام اور دل کو آسائش میسّر آئے۔ بعد ازاں جو عریضہ حضور والا کی خدمت میں روانہ کیا جارہا ہے اسے شروع سے آخر تک پلکوں کی درازی کے باعث اس کو نگاہیں نہ پڑھ سکیں اور اس طرح میں نے جو نالہ کشی کی کہ رات تک اس کا کوئی اثر ظاہر ہی نہیں ہوا یہ سب بے معنی بات ہے۔ کاغذات کا وہ دستہ جو مشاعرے میں میرے دستخط کے ساتھ نظر والا کی نگاہ سے گزرا ہے اس کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ مطلع یہ ہے:

نہ از ناز است کز چشم وے آساں برنمی آید
نگاہش 'با درازی ہاے مژگاں' برنمی آید

لیکن اصل شعر یہ ہے:

آہ، راں نالہ کہ تا شب اثرے باز نہ داد
بہ ہم آہنگیِ مرغانِ سحر خواں زدہؑ

(یہ بوجہ ناز و انداز نہیں کہ نظر اس کی آنکھوں سے باآسانی نکل نہیں پاتی اس کی نگاہ نے مژگاں کا درازی کے برابر آسکتی۔ نیز یہ شعر آہ و نالہ کہ رات تک جس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا اور جو اس طرح سر کیا جارہا ہے جیسے مرغانِ سحر صبح کے وقت اپنا نغمہ الاپتے ہیں۔)

مدّعا یہ کہ شعر کو غلط جانیں اور اس کے غلط متن کے ساتھ اسے نہ پڑھیں۔

دوسرے اسی صفحے میں مدرج ہے کہ گذاشتن وگذشتن و پذیرفتن کو راے ہوز سے لکھنا غلطی اِملا ہے۔

میرے نکتہ شناس اور ترجمہ فرما۔ غلطی املا اس وقت ہوتی ہے کہ لکھنے والا اس

سے واقف نہ ہو اور اس کی وجہ سے تحریر میں سہو ہو جائے حالانکہ سہو نہ ہو۔ ہماری تحقیق ہمارے لیے کافی ہے۔ اور اپنے طور پر اس کو تمام کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کو قبول کر لیں تو ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم خوشی سے اچھل پڑیں اور اگر اس پر اعتراض کیا جائے تو ہم غم و اندوہ سے نالہ و زاری کرنے لگیں۔

طرز تحریر کو غلطی املا کہنا غلط ہے۔ اگر اس کو غلطی تحریر کہا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مختصر یہ کہ غلطی املا یہ ہے کہ کوئی شخص ''ولد الحرام'' کو ہائے ہوّز سے لکھے اور ثالث کو دونوں جگہ سین مہملہ سے لکھنا یا اس طرح کی دوسری مثالیں جیسے احتراز کو ہائے ہوز سے لکھنا اور ربط کو تائے قرشت سے لکھنا ''وعلیٰ ہذا القیاس'' اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس تحریر سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ میں کوئی عریضۂ شکایت پیش کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ میں نے اپنے خط کے شروع میں لکھ دیا ہے۔ یہ تمام ''خامہ فرسائی'' اس خواہش کے ساتھ ہے کہ حقیقت تک پہنچنے والے سچائی کو جان جائیں اور معلوم کرنے والے صحیح طور پر معلوم کر لیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔

(اسد اللہ)

قبلۂ من

نوازش نامے جانِ ناتواں کو نوید عنایت سے نوازا۔ اور دستار کی رسید نے سرفرازی بخشی تحریر فرمایا گیا ہے کہ آج کی محفل میں جانا چاہیے ضرور شرکت کروں گا بشرطیکہ حضور والا قریب شام میرا انتظار فرمائیں۔ اس لیے کہ جب دن کے ختم ہونے میں ایک ساعت باقی رہ جائے گی میں اپنے سر کو قدم بناؤں گا اور حکیم صاحب کی پائے

بوسی کی سعادت سے سربلندی حاصل کروں گا۔

بعد ازاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور جناب والا کے ملازموں کے ساتھ اس انجمن میں پہنچوں گا۔آں جناب نے جو محاورہ کے باب میں استفسار فرمایا ہے۔قدم از سر ساختن سر را قدم ساختن۔سر قدم ساختن۔سر سے قدم بنانا۔یا سر کو قدم بنانا سر قدم بنانا۔معنی ان سب کے ایک ہی ہیں اور اہل زبان کے کلام میں یہ تینوں صورتیں راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں۔

اتنی بات میں ضرور سمجھتا ہوں کہ اہل ہند کے مذاق سخن میں قدم از سر ساختن معنی کے استخراج میں سہولت کے باعث وجہ ترجیح ہے اور اس حقیر کا جواب جو عنایت نامہ کے وسط میں مرقوم تھا مجملاً یہ ہے کہ جزو واحد کو دولخت نہیں کیا جانا چاہیے اور اس عنایت کو مکرر نہ شمار ہونا چاہیے۔یہ سعی کی جانی چاہیے کہ جو کچھ مطلوب ہو وہ عید سے پہلے یک مشت مجھ تک پہنچ جائے۔باقی تفصیلات وقتِ ملاقات گوش گزار کروں گا۔زیادہ نیاز

اسد اللہ

قبلۂ من

وہ سبز دوشالہ جو ملازمانِ حضور سے میری پشت کی زینت بن کر یہاں لایا گیا تھا اب کہار کے ہاتھ واپس ہو رہا ہے خدا کرے کہ پہنچ جائے دوسرے یہ کہ جو نیاز نامہ فیض الدین حیدر صاحب سلمۂ اللہ تعالیٰ کے نام ہے وہ ملازمانِ بارگاہِ عالی کی توجہ فرمائی سے ان تک پہنچ جائے گا اس توقع پر روانہ کر رہا ہوں۔دیگر یہ کہ میں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ جب بھی میں نزلے کی جلا میں مبتلا ہوں گا ''برشاسہ'' سے استعمال سے

لطف اٹھاؤں گا یہ دوا ابرَش کے نام سے معروف ہے اب وہ نزلہ اور وہ زکام میرے سرو دماغ پر مسلط ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ایک تولے کی برابر اس مرکب میں استعمال کروں گا اور دو تین دن تک اس کو جاری رکھوں گا۔ زیادہ نیاز

میرے مخدوم

صورتحال کچھ ایسی ہے کہ آپ کا یہ نیاز مند دو تین دن گزرنے کے بعد کلکتہ میں ہوگا۔ آنے والا کل کا دن کوچ کا دن نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اگر کوئی امر معنی نہیں ہوتا تو پنج شنبہ کے دن میں کشتی میں سوار ہو جاؤں گا جب میں نے یہ دیکھا کہ ابھی کچھ وقت باقی ہے بنا بریں خدمت والا میں حاضر نہ ہوا اور دوسرے مقاماتِ معلومہ کی سیر کو نکل گیا انشاء اللہ تعالیٰ یک شنبہ کے دن ہم ایک دوسرے سے رخصتی ملاقات کریں گے۔ زیادہ نیاز امید کہ جنابِ والا مجھے مرزا غلام حسین کے حال احوال سے مطلع فرمائیں گے۔ علاوہ برایں مکتوبِ ڈھاکہ کی روانگی سے متعلق آگاہ کریں گے۔ ملا ظہوری کہ اللہ پاک ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ ان کا دیوان گمانِ غالب ہے کہ خواجہ مستقیم صاحب تک پہنچ چکا ہوگا۔ والسلام والاکرام۔

....

قبلۂ من

عنایت نامہ پہنچا اور صورتحال سے آگاہی بخشی بندے کے پاس آج کے کھانے کے معاملے میں دو صریح عذر موجود ہیں ایک یہ کہ میں رات کا کھانا اکثر نہیں کھاتا دوسرے یہ کہ آج روزِ یکشنبہ ہے یہ وہ دن ہے کہ میں گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں دستر خوان پر بیٹھتا اور کوئی بوٹی کا ٹکڑا اور ریزہ کباب

ضرور کھاتا امید کہ حضورِ والا مجھے ان دونوں صورتوں کے پیشِ نظر معاف فرما دیں گے
میرے لیے تھوڑا سا اولوش ضرور اٹھا کر رکھیں گے۔ کل صبح کے وقت میں حاضر ہوں تو
اس میں سے کچھ کھا پی کر رخصت ہوں گا اور دریا کے کنارے پہنچ کر کشتی میں بیٹھوں گا
اور روانہ ہو جاؤں گا۔ آج کے دن حاضر ہونا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں زیادہ
بندگی۔ مولوی سراج الدین احمد کو میری جانب سے سلام پہنچا دیا جائے۔ فقط

(اسداللہ)

.....

مخدومی و مکرمی

جناب مرزا صاحب والا مناقب اللہ پاک انکی عنایتوں کو روز افزوں کی مجھے ایک لطیف بات دل میں آئی ہے اور میں ارادہ کر رہا ہوں کہ خدمتِ عالی میں پہنچ کر آپ کی معیت میں راؤ صاحب معلیٰ القاب راؤ شو راؤ کے دولت خانے پر حاضر ہوں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی جو عنان گیرِ شوق بن گئی کہ جو خلوت میسّر آنی چاہیے وہ سرِ دست میسر آنا ممکن نہیں اس لیے عرضِ خدمت ہے کہ رقعۂ ہذا کو راؤ صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا دیا جائے اور آں موصوف کو میرے مدعا بے دلی سے آگاہ کیا جائے۔ تا کہ آخرِ روز یا اولِ شب میں جنابِ والا اور راؤ صاحب مکرم میرے غربت کدے کو اپنی قدم رنجائی سے اعزاز بخشیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اس معاملے میں آنجناب کی طرف سے کسی طرح کا تغافل نہ برتا جائے گا۔ عرضِ نیاز کے ماسوا اور کیا پیش کروں۔ (دورانِ قیامِ کلکتہ)

(اسداللہ)

.....

عالی جناب

اللہ پاک آپ کے لطفِ وکرم کو ہم نیاز مندوں کے حال پر زیادہ سے زیادہ بڑھائے۔ کہار میرے عبودیت نامے کے ساتھ نظر گاہِ والا میں پہنچ رہا ہے امید کہ آپ رحم علی سے یہ فرمادیں گے کہ دستار بند سے لے کر کہار کو دے دی جائے۔ اور اس کی مزدوری کہار سے لے کر دستار بند کو پہنچادی جائے۔ زیادہ نیاز بعدِ نیاز۔ (دورانِ قیام کلکتہ)

(اسداللہ)

مخدومِ غالب

میری بے کسی کی پشت پناہی کرنے والے۔ میرا دل محمد علی خاں اور اس کے بھائی کی صورتِ حال پر پریشان ونگراں ہے۔ امید ہے کہ آج کل ہی میں فرصت پا کر مجھے اپنی تحریر خط سے یاد فرمائیں اور اس خوش خبری کو جوان کی خیر وعافیت سے متعلق ہے، مجھ تک پہنچائیں گے۔ میرے تن بے جان میں جان آجائے گی۔ اور مجھے تشویش وپیچ وتاب سے نجات ملے گی۔

(اسداللہ)

(۱۲۴۴ھ اگست ۱۸۲۸ء)

(جنوری ۱۹۲۹ء/ رجب ۱۲۴۴ھ)

میرے مخدوم میرے لئے لایقِ اطاعت اور میرے تیئں جائے پناہ مرزا احمد بیگ صاحب جن کے لطف کو اللہ ہمیشہ باقی رکھے۔ میں آں جناب کی بارگاہِ عزت پناہ میں اپنی ایک عرضی پہنچا رہا ہوں۔ آج جب بھی وقت ملے گا میں پہلے دفتر

خانہ پہنچوں گا اور وہاں سے بارگاہ میں پہنچ کر لاٹ صاحب کی ملازمت میں حاضر ہوں گا۔

آج بھی کل کی طرح جناب مرزا افضل بیگ صاحب اور حضرت مولوی سراج الدین احمد صاحب سے یہاں اتفاق ملاقات میسّر آیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کل دوپہر تک میں اپنے غم کدہ میں پہنچ جاؤں گا۔ دوشالہ مخمل کل کے لئے کہ جس کا رقعہ پہنچ گیا ہے اٹھا کر رکھ لیا گیا۔ اور صافہ چونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے خدمتِ اقدس میں بھیج دیا گیا۔ زیادہ تسلیم و ہناز۔ محمد اسد اللہ

(مرقومہ دوشنبہ ۱۲ر شعبان ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۶ر فروری ۱۸۲۹ء)

قبلۂ من

عنایت نامہ پہنچا اور صورتِ حال سے آگاہی ہوئی بندے کو آج کے کھانے کے معاملے میں دو صریح عذر ہیں ایک یہ کہ میں رات کے وقت کھانا نہیں کھاتا۔ دوسرے آج روزِ یک شنبہ ہے اور میں یک شنبہ کے دن گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں دستر خوان کے کنارے ضرور بیٹھتا اور شریکِ طعام ہوتا۔ ریزۂ نان و کباب کھاتا امید کہ مجھے بہر صورت معاف رکھا جائے گا مگر میرے لئے بطورِ اولوش کچھ حصہ ضرور اٹھا کر رکھ دیا جائے گا میں کل بوقتِ صبح حاضر خدمت ہوں گا اور اس میں سے کچھ کھا کر آپ سے رخصت چاہوں گا اور کنارے دریا پہنچ کر کشتی میں بیٹھوں گا اور روانہ ہو جاؤں گا آج حاضر ہونا کسی طرح ممکن نہیں زیادہ بندگی۔ مولانا سراج الدین احمد کو میرا سلام پہنچا دیں۔ فقط

(اسد اللہ)

(نگاشتہ یک شنبہ ۱۵ر صفر ۱۲۴۵ھ مطابق، ۱۶ر اگست ۱۸۲۹ء)

قبلۂ من

جو سبز دوشالہ بارگاہِ والا سے میرے بر و دوش کی زینت بن کر یہاں لایا گیا تھا۔ اب کہار کے ہاتھ اسے بھیجا جا رہا ہے۔ بس یہ سلامت پہنچ جائے۔ دوسرے یہ عرض ہے کہ جو نیاز نامہ فیض الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بھیجا رہا ہے۔

یہ حضرتِ والا کے ملازموں کی توجہ کے باعث اگر مکتوب الیہ تک پہنچ جائے اور ان کی نظر سے گزر جائے تو کتنا اچھا ہو۔ دیگر یہ کہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جس میں نزلہ و زکام میں مبتلا ہوں گا تو ''برشعسا'' کہ بالفعل برش کر نام سے مشہور ہے اس کا چاشنی گیر ہوں گا۔ آج کل میں بے طرح نزلہ و زکام کا شکار ہوں۔ امید یہ کہ ایک تولہ وہ دوا مجھے عنایت کی جائے تا کہ میں دو تین روز تک اس کا استعمال جاری رکھوں۔ زیادہ نیاز۔

اسد اللہ۔

اسد اللہ۔ (محررہ ششم صفر روز آدینہ ۱۲۴۵ھ مطابق، ۷ اگست ۱۸۲۹ء)

میرے مخدوم اور میرے تئیں قابلِ اطاعت سلامت رہیں۔ آج ''کہار'' پانی لانے کے لیے لال ڈگی پر گیا۔ چوں کہ صبح کا وقت ہے دونوں دوسرے آدمی اور کاموں میں لگے ہوئے ہیں ناچار ''کہار'' بچے کو اس عبودیت نامہ کے ذریعہ میں نے آپ کی آستاں بوسی کے واسطے بھیجا۔ کیا ہی یہ اچھا ہو کہ آپ کے درِ دولت کے ملازموں میں سے کوئی ملازم ''جامِ جہاں نما'' کے اوراق لے کر اس ''کہار'' بچے

کے ساتھ مجھ تک پہنچ جائے۔

ریزیڈینٹ دہلی کا جو حال میں نے صفحات پر لکھا ہوا پایا ہے وہ جوں کے توں خدمت اقدس میں بھیج رہا ہوں۔ اگر درِ دولت کے کسی ملازم کے بغیر "کہار" بچے کے ہاتھ بھیجے گئے تو ضائع ہونے کا خوف بہرحال میرے ذہن پر چھایا رہے گا۔ زیادہ نیازمند۔ امید کہ دست وقلم کی زحمت گوارہ فرما کر مجھے خوشنودیِ مزاج سے مطلع فرمائیں گے تا کہ میرا دلِ شوریدہ آرام پا سکے اور میری جان جو ہوا ہو رہی ہے اس کو سکون ملے۔ والسلام جس کے ساتھ خیریت کی مہر لگی ہوئی ہے۔

(اسداللہ)

(جنوری ۱۸۲۹ء۔ رجب ۱۲۴۴ھ)

میرے مخدوم ومکرم والاقدر وعالی مرتبت۔ "جامِ جہاں نما" کے اوراق پہنچ گئے ریزیڈینٹ دہلی کا حال میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ معلوم ہو گیا کہ ہنوز وہ الور میں ہیں۔ اگر وہاں سے صاحب ریزیڈینٹ جے پور اور جودھپور چلے گئے تو پھر ایک مدت تک وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

اگر وہاں سے ریزیڈینٹ واپس آجاتیں تو بغیر کسی تاخیر کے درستیِ کار کا تصوّر تو کیا جا سکتا ہے۔ قصّہ مختصر یہ کہ ان اوراق کو دیکھ کر نوازش نامہ کے حامل کو سپرد کر دیا گیا۔ دوشالہ بھی انہیں کے وسیلے سے بھیجا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ آپ تک پہنچ جائے گا۔

کیا تماشا ہے کہ "گلِ رعنا" کے اجزا نہ مجھے یاد آ رہے ہیں اور نہ جناب نے بھیجے یہ بھی تحریرِ عریضہ کے بعد مجھے یاد آ گیا۔

(اسداللہ)

میرے مخدوم

میرے لئے قابلِ اطاعت بزمِ طرب میں تقرب کا حال ہنوز معلوم نہیں ہوا۔ امید کہ آپ اُس کے زماں و مکاں کی کیفیت سے آگاہ فرمائیں گے کل مخدومی! نواب علی اکبر خاں کا مکتوبِ گرامی مجھے ''ہگلی'' سے موصول ہوا کہ میرا دل ان کی نوازشوں اور عنایتوں کا حد درجہ مرہونِ منت ہے۔

نواب صاحب موصوف آج کل بیمار ہیں اور مجھے عیادت کے لئے طلب فرمایا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ وہاں جاؤں اور ایک ہفتہ وہاں قیام کروں۔

اس سلسلے میں مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اگر موجودہ چہارشنبہ کہ پانچ دن کے بعد آرہا ہے۔ انجمن کے انعقاد کا دن مقررر ہو گیا ہے تو میں وہاں جانے میں تھوڑا تکلف اختیار کروں۔ اور چہارشنبہ کے بعد جاؤں اور اگر احیاناً محفل آرائی کا دن ماہِ رمضان میں قرار پایا ہے تو میں جلدی ہی وہاں چلا جاؤں گا اور جب تک یہ مقررہ وقت آئے گا میں واپس آجاؤں گا۔

امید یہ ہے کہ اس بارہِ خاص میں جو بات آپ کے ضمیرِ روشن میں ہو اُس کا اظہار فرما کر مجھے شادماں کریں۔ اور اس فکر سے نجات دیں زیادہ نیاز۔

(اسد اللہ)

(نگاشتہ جمعہ، ۲۳ رشعبان ۱۲۴۴ھ، مطابق ۲۷ رفروری ۱۸۲۹ء)

جناب فیض مآب حضرت مرزا احمد بیگ خاں صاحب اللہ پاک ان کی مہربانیوں کو قائم رکھے۔

جنابِ والا خواجہ فیض الدین حیدر صاحب کے نام لکھا جانے والا خط بھی مکتوب گرامی کے ساتھ جہانگیر نگر روانہ فرما دیں گے۔

التماس ہے کہ ایک عزیز نے راہِ دور سے اس کے باوجود کہ آپس میں زیادہ محبت اور بے تکلفی نہیں ہے، مہربانی نامہ بھیجا ہے۔ اگر جواب نہیں پہنچے گا تو اس کو میری بے دماغی پر محمول کیا جائے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ حضرتِ والا اس مکتوبِ کے ساتھ اپنی طرف سے ایک خط لکھ کر روانہ فرما دیں یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ نیاز مند

(اسداللہ)

(نگارشتہ یک شنبہ ۲ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابق ۸ مارچ ۱۸۲۹ء)

میرے قبلہ

آپ کے کرم نامہ نے میری روح کو نوید عنایت سے نوازا اور دستارِ روانہ فرما کر مجھے سرفراز فرمایا ہے۔ اس میں تحریر تھا کہ آج محفل میں پہنچنا چاہیئے۔ یہ اس شرط پر ہوسکتا ہے کہ جناب سرِ شام میرے وہاں پہنچنے کا انتظار فرمائیں۔ جب ایک گھڑی دن باقی رہ جائے گا تو میں اپنے سر کو قدم بناؤں گا۔ اور اس محلّہ میں پہنچ کر پہلے حکیم صاحب کی قدم بوسی حاصل کروں گا اور وہاں سے آپ کی خدمت میں پہنچوں گا اور جنابِ والا کے ملازموں کے ساتھ اس انجمن میں باریاب ہوں گا۔

اور یہ ہے کہ حضرتِ والا نے محاورہ کے باب میں میری رائے معلوم کی ہے۔ حال یہ ہے کہ ''قدم از سر ساختن'' و سر را قدم ساختن، و ''سر قدم (ساختن)'' اپنے معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں اور اہلِ زباں کے کلام میں تینوں انداز سے ان کا

استعمال راقم کی نظر سے گزرا ہے۔

ہاں میں اتنی بات جانتا ہوں کہ اہلِ ہند کے مذاق کے مطابق ''قدم از سر ساختن''، سہولتِ استخراج کے طور پر زیادہ قابل قبول ہوگا۔

اس فقرہ کے جواب میں جو عنایت نامہ کے وسط میں لکھا ہے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جزوِ واحد کو دو حصوں میں نہیں بانٹنا چاہیئے ۔ اور اس عنایت نامہ کو مکرر نہ شمار کیا جائے یہی مناسب ہے، کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ مطلوب ہے وہ عید سے پہلے یکمشت مجھے مل جائے۔ باقی تفصیلات ملاقات کے وقت گوش گزار کی جائیں گی۔

زیادہ نیاز مند۔

اسد اللہ

(مرقوم چہار شنبہ ۲۶ رمضان ۱۲۴۴ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۲۹ء)

میرے مخدوم

کچھ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بندے کو دو تین روز تک مزید کلکتہ میں رہنا ہوگا۔ آنے والی کل رخصت کا دن نہیں ہے۔ یقین یہ ہے کہ اگر کوئی اَمر مانع نہ ہوا اور باعثِ رکاوٹ نہ بنا تو میں پنج شنبہ کے دن کشتی میں بیٹھ جاؤں گا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ ابھی تک وقت باقی ہے۔ تو میں خدمتِ عالی میں نہ پہنچا۔ اور معلومہ جگہوں پر جانے کو بھی ملتوی کیا۔ انشاء اللہ یک شنبہ کے دن ایک دوسرے سے رخصتی ملاقات ہوگی۔ امید یہ کہ مجھے مرزا غلام حسین کے بارے میں اطلاع دی جائے گی ۔ اس کے ماسوا اس

مکتوب کے بارے میں آگاہی بخشی جائے گی جو ڈھاکہ بھیجا گیا ہے ملا ظہوری کا دیوان گمانِ غالب ہے کہ خواجہ مستقیم صاحب تک پہنچ گیا ہوگا۔ والسلام، والا کرام، فقط

(اسداللہ)

(مرقومہ روز شنبہ، چہاردہم صفر ۱۲۴۵ھ دپانزدہم اگست ۱۸۲۹ء)

میرے مخدوم ومکرم مرزا صاحب والا درجات

اللہ تعالی آپ کی عنایتوں کو میرے حال پر برابر قایم رکھے۔ ایک بات گوشۂ خاطر میں آرہی ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ خدمتِ عالی میں پہنچوں اور حضرتِ والا کہ ساتھ راجہ شوراؤ صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوں لیکن تامل برابر میرے شوق کا عنان گیر ہو رہا ہے کہ جس طرح کی خلوت کا میں خواہش مند ہوں وہ دونوں جگہوں میں سے کسی جگہ بھی میسر نہ آئے گی لہٰذا معروضِ خدمت ہے کہ میرے اس خیال کو راؤ صاحب کی نظر گاہ تک پہنچا دیا جائے اور ان کو میری عرض داشت سے آگاہ کردیا جائے جیسا وہ پسند کریں خواہ آخرِ روز اور خواہ اوّلِ شب راؤ صاحب اور حضرتِ والا میرے غم کدہ پر رونق افروز ہوں اس معاملے میں ہرگز تغافل نہ برتا جائے سوائے عرض نیاز کے اور کیا لکھوں۔ عاصی۔ اسداللہ

(دورانِ قیام کلکتہ)

عالی جناب

اللہ تعالیٰ آپ کی عنایتوں کو قائم ودائم رکھے۔ کہار میرا بندگی نامہ لے کر

خدمتِ اقدس میں پہنچ رہا ہے امید کہ رحم علی سے فرمایا جائے گا کہ دستار بند سے صافہ لے کر اور اس کی اُجرت اسے ادا کر کے کہار کو سونپ دی جائے۔ زیادہ نیاز۔

(اسد اللہ)

(دورانِ قیامِ کلکتہ)

میرے مخدوم سلامت

ہفتے بیت گئے کہ آنکھیں آپ کو دیکھنے اور کان آپ کی باتیں سننے سے محروم ہیں۔ پوشیدہ نہ رہے کہ جناب مولانا سراج الدین احمد نے خدا ان کے سائے کو قائم رکھے۔ ظلم وستم کا دامن ہاتھ میں لیا اور مجھے اپنے ساتھ برجو تالاب کے ہنگامے میں لے گئے۔ مجھے گمان تھا کہ میرے مخدوم بھی سیر تماشے کی غرض سے وہاں جائیں گے ہر چند میں نے اور مولانا نے اس امید میں حلقت کے ہجوم کو پردے کی طرح جگہ جگہ سے پاک کر ڈالا لیکن جناب والا کے ملازموں کی گرد تک بھی نہ پہنچے۔

اپنی محرومی کے احساس سے بہت پیچ وتاب میں پڑے کہ ہم براہِ راست آپ کی خدمت میں کیوں نہ پہنچے۔ ہر چند آپ کے تغافل اور بے نیازی کے بارے میں بہت سی باتیں سوچتے رہے کہ ان دس بارہ دنوں میں جنابِ والا نے ہماری خبر تک نہ لی اور یہ خیال نہ فرمایا کہ فلاں شخص کہاں چلا گیا اور اسے کیا پیش آیا۔ بہر حال سلامت رہیں اور تادیر رہیں۔

فقط اسد اللہ

(دورانِ قیامِ کلکتہ)

قبلۂ من

میں اس مہربانی کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ آپ نے ایک عمر کے بعد یاد فرمایا اور میرے پاس سوائے بے مصرف عمر گزارنے کے اور کام ہی کیا رہا میں جانتا ہوں کہ اب عمر ہی کتنی باقی رہ گئی ہے تو اب اس سپاس گزاری سے قطع نظر کیسے کی جا سکتی ہے میں اپنی زبان کو تالو سے باہر کھینچنا اور دل و جان کے سپرد کرنا چاہتا ہوں تا کہ میں جو سپاس گزاری کروں اس کا کام و دہان سے کوئی واسطہ نہ رہے خدارا ہم بے بسوں، بے کسوں کو اور ہم جیسے بے قصور، خطا واروں کو خط سے یاد فرماتے رہیے آپ کا سایہ دیر تک ہم نیازمندوں کے سروں پر قائم رہے۔ دل کی گہرائیوں اور زبان کی تابانیوں کے ساتھ آپ کے فرزندوں تک میری دعا پہنچے۔

(ہشتم شوال وروز آدینہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۰/اپریل ۱۸۴۵ء کے بعد)

تنت بہ نازِ طبیباں نیاز مند مباد

وجودِ نازکت آزردۂ گزند مباد

تیرا نازک بدن (کالبد انسانی) طبیبوں کے ناز کے سامنے کبھی نیازمند نہ ہے یعنی آپ ہمیشہ صحت مند رہیں۔ اور ترا وجودِ نازک کسی تکلیف کی گزند برداشت کرنے کے لئے کبھی مجبور و معذور نہ ہو۔

میرے قبلہ و کعبہ

چند روز پیشتر صحیفۂ گرامی حکیم صادق علی کے وسیلے سے مجھ تک پہنچا۔ میں نے جواب تحریر نہیں کیا تھا کہ آج جب کہ ستمبر کی چار تاریخ ہے اور ربیع الاوّل کے

بارے میں نہیں جانتا کہ اس کی کون سی تاریخ ہے کہ مجھے ایک خط مولوی سراج الدین صاحب کی طرف سے موصول ہوا جنہیں نیک لوگوں کا قبلہ کہنا چاہیئے یہ جان کر کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے مجھے بہت افسوس ہوا۔ چونکہ اسی تحریر میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ حکیم احمد علی صاحب کی حسنِ تدبیر سے میرے قبلۂ صورت و معنی کو تھوڑا سا افاقہ ہوا تھا۔

جس حد تک مزاجِ مبارک کی درستی کا حال معلوم ہوا ہے اتنا ہی یہ کہیے کہ مجھے ہجومِ آلام سے فرصت و فراغت نصیب ہوئی ہے۔ خدارا مجھ زار و نزاء سے قطع نظر نہ فرمایئے اور جلد از جلد مجھے اپنی صحت یابی کی نوید سے نوازیئے۔

میں اس کے بعد آپ کا خط آنے کے انتظار میں دن گنتا رہوں گا۔ حکیم صادق علی خاں نے جو خط مجھے لکھا ہے اُس سے مترشح ہوتا ہے کہ ''ہگلی'' کے علاقہ سے آپ تعلق منقطع کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ علاقۂ جہانگیر نگر سے بھی قطع تعلق کا خیال رکھتے ہیں کلکتہ سے آپ کی طبیعت ملول ہے اور دارالخلافہ دہلی کا احرام باندھے ہوئے ہیں۔ اس خط میں کچھ ایسا ہی لکھا تھا۔

ہر چند حضورِ والا کا دھیان دہلی کی طرف ہونا بے انتہا خوشی کا سبب ہے مگر کلکتہ سے دل کا ملول ہونا افسوسناک بات ہے۔ واللہ باللہ دہلی اس لایق نہیں ہے کہ وہاں کوئی آزادہ رو خاک نشینی اختیار کرے۔

اس جگہ کے رہنے والے خاص و عام بے سبب ستاتے ہیں اور یہاں کے مرد و عورت یہ کہیے کہ مردار خوار ہیں۔

میں تو یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ جب یہ مقدمہ ختم ہو جائے تو کسی بہانہ سے یہاں

سے نکل جاؤں اور دوبارہ کلکتہ پہنچ جاؤں۔ وہاں کے عزیزوں کو طولِ عمر کی دعا اور افزونیِ دولت کی دعا پہنچے۔

(اسداللہ)

(نگاشتہ ۴ر ستمبر ۱۸۳۰ء مطابق ۱۵ر ربیع الاول ۱۲۴۶ھ)

میرے قبلہ

آپ کا فرمان میرے جان و دل پر رواں ہے آپ جو فرمائیں گے میں اس کو اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ تسلیم کروں گا اور سر کے بل دوڑ کر اسے بجالاؤں گا۔

آپ دہلی والوں کے رویہ سے واقف نہیں۔ میں جتنا کہ حالات سے آگاہی کے لیے جدوجہد کرتا ہوں، لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں اور آپ سے بدگمان ہوتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مرزا احمد بیگ خاں نے مجھ اسداللہ کو اپنی طرف سے اس بات کے لئے مقرر کیا ہے کہ میں رفتہ رفتہ تمام امور میں دخل دوں۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو بدنام اور مجھے رسوا نہ کیجئے۔ آدمی کو چاہئے کہ اگر وہ واقعتاً کسی معاملہ سے دلچسپی رکھتا ہو تو اپنے آپ کو اس حد تک اس خاص معاملہ میں فارغ اور لاابالی ظاہر کرے کہ کوئی شخص اس کے رازِ دلی سے آگاہ نہ ہو۔

آپ جیسا کوئی صاف دل آدمی اس کے برعکس کرتا ہے کہ بے لوث اور بے غرض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو دوسرے کی نگاہ میں انتہائی خودغرض بلکہ لالچی قرار دیتا ہے۔

مدعا یہ ہے کہ اس گروہ یعنی حکیموں پر سچ بولنے کا گمان ہرگز نہ کیجیے۔ اور ان سب کو اپنے سے وحشت زدہ اور اپنے مخلصوں سے خوف میں مبتلا سمجھیے۔ اگر یہاں آنے کا کوئی خیال ہو تو خاموش رہیئے۔ اور جب آپ آنا چاہیں آجایئے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے۔

نواب مہدی علی خاں کے حالات سے میں باخبر نہیں ہوں اس سراسیمگی کے عالم میں کہ دائیں بائیں سے مجھے خوف خطر کے شکنجے میں کھینچ رکھا ہے۔ یہ خط لکھنے کی مجال کہاں نواب صاحب کو ہم ایسے خاکساروں کی یاد کہاں آتی ہے۔ فقط

اسداللہ فقط

(ربیع الثانی ۱۲۴۶ھ مطابق ستمبر، اکتوبر ۱۸۳۰ء)

جن کا دل درد سے بے تاب ہو ان کو نالہ و فریاد سے کون روک سکتا ہے اور ماتم زدوں کو اس سے کون منع کر سکتا ہے کہ وہ سینہ کوبی کریں میرا دل جو آپ کی بے مہری سے دردناک ہے نالہ و فریاد کے علاوہ اس کے لیے چارۂ کار ہی کیا ہے۔ میں نے درِ تغافل میں اپنی جان دے ڈالی اور اب ماتم وفا میں بیٹھا ہوں۔ مجھے اپنا سینہ تو کوٹنا ہے چاہے میرے پاس سنگِ خارا ہو یا نہ ہو۔

ہفتے دو ہفتے اس طرح گزر گئے مولوی سراج الدین احمد کے پاس سے اگر کوئی خط نہ آجاتا تو میں اپنے جگر کو اپنے دانتوں میں لیتا اور بے خود ہو کر اسے چبا جاتا۔ وہی آپ ہیں وہی سراج الدین احمد ہیں وہی یہ دردمند اور اندوہ گیں شخص یعنی میں ہوں۔

چھے ماہ گزر گئے کہ کسی دوسرے شخص کے مکتوب یا خط کے حاشیہ پر بھی

آپ نے مجھے سلام سے یاد نہیں کیا اور آپ کا کوئی پیغام مجھ تک نہیں پہنچا میری طرف سے خط کا نہ جانا اس سبب سے نہیں ہے کہ میں نے آپ کی طرح محبت کو ترک کرنے کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس وجہ سے بھی نہیں ہے کہ غم واندوہ میں اس بری طرح مبتلا ہوں کہ سانس لینے اور بات کرنے کی بھی اب مجھ میں سکت نہ رہی۔

میں اپنے خدا کا شکر گزار ہوں جو منصف و داد گر ہے کہ میرے اس تنِ لاغر کے باوجود میرے دل کو اس نے توانائی اور صحت مندی بخش رکھی ہے کہ اگر مثال کے طور پر دونوں عالم درہم برہم ہو جائیں تب بھی میں اپنی جگہ ثابت قدم رہوں گا۔ ان تمام مصائب و آلام کے باوجود میری وفاداریوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میرا سر اُڑا دیا جائے تو میرا قدم محبت اور اطاعت گزاری سے ہرگز باہر نہ آئے گا۔ اور اس میں کوئی لغزش پیدا نہ ہوگی۔ خدارا بتایئے کہ آپ کے دل میں یہ کیا بات آئی ہے اور مولوی سراج الدین احمد کے من میں کیا سمائی ہے شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسد اللہ کا میری طرف رجوع کرنا اس وجہ سے ہے کہ میں کونسل کے دفتر سے متعلق افراد میں سے ہوں۔ یعنی جس روز سے کہ آپ صدرِ عدالت کے پیش کار ہوئے ہیں اور آپ نے اس عہدہ کو زینت بخشی ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے یاد فرمایا گیا ہو۔ فقط۔

(اسد اللہ)

(جمعہ ۲۵ رصفر ۱۲۴۷ھ، مطابق ۵ راگست ۱۸۳۱ء)

سپہر آستاں!

آپ کا منشور غالب کی سرفرازی کا باعث ہوا اور اس کے سوادِ خط سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ دو تین دن کے بعد جو کچھ خاطرِ عاطر سے گزرے گا وہ بھی اعلان کے رنگ وجو سے آراستہ ہوگا۔

آج نوابِ والا جناب معلیٰ القاب محمد مہدی علی خاں بہادر میرے غربت کدہ پر رونق افروز ہیں۔ کیا اچھی قسمت ہے میری اور کیا ہی اچھا وقت مجھے نصیب ہوا ہے (کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں)۔

میرے مشفقِ ومہربان خواجہ مستقیم تک میرا اسلامِ نیاز پہنچے اور ان کی پذیرائی سے بہرہ ور ہو۔

(اسد اللہ)

(دورانِ قیامِ کلکتہ)

بنام مولوی سراج الدین احمد

میرے امید گاہ، کل کی صحبت نے میرے ضمیر پر ملال کی گرد نہیں بکھیری اور خارِ غم میرے پیراہن میں وجہِ خلش نہ بنا کہ مجھے سخن سازی کے واسطے دل ودماغ میسر آجائے۔

قسم بہ خدا میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جو مکر وفریب کی بنا پر ہو میں جو کچھ کہتا ہوں نہ وہ چاپلوسی کی راہ سے ہے اور نہ اس کا تعلق نفاق سے ہے خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ملازمانِ والا کے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ غالب شوریدہ حال کو شملہ بازار کے ویرانے میں ایک اُلّو کی طرح نہ رہنا چاہیے بلکہ قصرِ جلال کی دیوار پر آشیاں بندی

کرنی چاہیئے۔ اوراس عنایت فرمائی کا منشا ان دو باتوں کے ماسوا کیا ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ آپ میری قربت کے بے حد مشتاق رہتے ہیں دوسرے یہ کہ ایسا سوچ کر آپ نے میرے حالِ زار پر (کہ میں عالمِ غربت میں ہوں) ایک گونہ رحم کھایا ہے۔ اگر وہ ہے جس کا ذکر میں نے پہلے کیا تو مجھے معاف رکھا جائے گا۔ اور اگر یہ ہے تو میں اس کو اپنے حق میں انصاف سمجھتا ہوں۔

جب دوری کے عالم میں، میں اس طرح خطاب و عتاب کا سزاوار قرار پاتا ہوں تو آپ کے قریب رہ کر اپنے نفس کی حفاظت کیسے کرسکتا ہوں۔ اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہوں۔ میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ میں بے وقوفوں کی دراز نفسی کا شکوہ سنج نہیں ہوں۔ لیکن فقہا کی ناانصافیوں سے میں کیسے کہوں کہ مجھے شکایت نہیں۔

پہلے تو لوگوں کی زبان پر یہ تھا کہ فلاں یعنی میں قتیل کو برا بھلا کہتا ہوں۔ نہ جانے کتنے لوگ میرے خلاف برسرِ شورش ہوئے اور مخالفوں کی ایک جماعت مجھ پر اعتراض کرنے لگی اور جھگڑے پر آمادہ ہوگئی۔

ایک شخص کو میرے سامنے لایا گیا اور مجھے وادی سخن کا ''صیدِ زبوں'' خیال کیا گیا۔ جب (انہوں نے) دیکھا کہ وہ کوئی آڈمبر کھڑا نہ کرسکے اور اپنے بازار کی رونق کو خود انہوں نے اپنے لاف و گزاف سے ختم کردیا۔ وہ سب کے سب اس بات پر آمادہ ہوئے اور انہوں نے فیل و رُخ کو طرح دے کر بساطِ شطرنج پر جواُن کی دشمنی کا میدان ہے۔ دوڑانا شروع کیا۔

مجھے انہوں نے حیران و پریشان کردیا خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جو کچھ میں حاکمانِ زمانہ سے چاہتا ہوں وہ میرے سلیقۂ شاعری سے مشروط نہیں ہے۔ اس عربدہ

جوئی سے اسے کیا واسطہ اور اس ہنگامہ سے کیا نقصان۔

آوازِ سگاں کم، نہ کند رزقِ گدارا

لیکن چونکہ چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی عقاب کے بال و پر رکھتی ہیں اور کم پانی والی ندیاں بھی سمندروں جیسے جوش وخروش کے ساتھ بہتی ہیں میرا دل اس وادی سے برآشفتہ خاطر ہوگیا۔ میں بہت غمگین ہوں میں نے عاجزی کے ساتھ اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ دیا لیکن اس کی بھی پذیرائی نہ ہوئی۔ میں نے عذر ومعذرت کی راہ اختیار کی کسی نے مجھے مرحبا نہ کہا۔ میں حیرت میں ہوں کہ بزرگانِ انجمن کو میں اپنی کون سی خدمت سے خوش کروں کہ ان کے لئے وہ خدمتِ شائشتہ ہو اور اس کے بدلے میں وہ مجھے لایقِ تحسین تصوّر کریں۔

یہ تمام خونابہٗ دل کو بغیر خواہش کے لب ودہن سے تراوش پاتا ہے اور اس میں مدّعا کی جلوہ نمائی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا جو بات مجھے اظہار پر مجبور کررہی ہے وہ یہ ہے کہ ستارہ شناسوں کا ایک کلّیہ یہ ہے کہ جس پر خدا کی بخشش وکرم کی نگاہ ہوتی ہے اس کو مبارک ستاروں کی عداوت کی نظر کوئی نقصان نہیں پہنچاتی اور منحوس ستاروں کی مہربانی کی نظر سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

خدا کی عظمت وجلال کی سوگند کہ میں آپ کی ذات کو پاکیزہ گوہر اور نیک نہاد خیال کرتا ہوں۔ اور مرزا افضل بیگ اگر اس نسبتِ اضافی سے جو بظاہر موجود ہے، قطع نظر فرمائیں۔ تب بھی میں آپ کو کریم النفس اور انتہائی نیک طبیعت سمجھتا ہوں۔ اور آپ کی عداوت اور مرزا صاحب کی ہمزادگی کو اس دیار کے بزرگوں کی مودّت سے بہتر سمجھتا ہوں۔

ان حالات میں عداوت کی کیا گنجائش ہے اور دشمنی کا کیا محل یا (موقع) ہے۔ اس لیے کہ اس کی کوئی وجہ بھی تو درمیان میں نہیں ہے اور عداوت تو خود اعراض میں سے ہے۔ یعنی محض پہچان کی چیز ہے وہ جو ہر تھوڑا ہی ہے۔

ہاں ہاں! اس خرابہ میں اپنی جگہ سے اُٹھنا اور حضورِ والا کی بارگاہ کے سایۂ عنایت و مہربانی سایہ میں رہنا اور وہاں اُفتادگی کا بستر لگا دینا بھی رنجش کا احتمال پیدا کرتا ہے۔ اور آزردگی کا خوف دامنِ خیال 'کو گرد آلود' کرتا ہے۔

میں آپ کی آزردگی کا تو کوئی علاج کرسکتا ہوں اور آپ کے عتاب کو اپنے تیئں گوارہ بنا سکتا ہوں۔ مگر مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ اگر میں اس طائفے سے قریب آؤں گا تو مجھے کیا کیا تکلیف نہ پہنچے گی۔ اور کون کون سی ایسی باتیں ہوں گی جو دیکھنے کے لایق نہ ہوں گی۔ اور مجھے دیکھنی پڑیں گی۔

سچ یہ ہے کہ دوست کا آزار دینا دشمن کی مہربانی سے بہتر ہے۔ جب قاعدہ یہ ہے اور میرا سوادِ ضمیر بھی بیگانگی کے گرد و غبار سے پاک ہوگیا ہے تو میں مدّعائے ضرور الاظہار کو زبان پر لاتا ہوں۔ اور جو بات میں برابر سوچتا رہا ہوں اس کے چہرہ سے پردہ اٹھاتا ہوں۔

اگر میرا ساتھ رہنا دوامِ صحبت کے خیال سے ہے تو وہ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ صبح کے وقت دفتر خانہ جانا اور شام کے وقت وہاں سے اپنے کاشانہ کی طرف واپس آنا۔ میرا معمول ہے۔ رات کا وقت آرام کے لئے ہے نہ حرف و حکایت کے لیے۔

اگر یہ تمام کوشش میری غم خواری و دلجوئی کے لئے ہے تو میرے حالات پر

بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے کہ میں کس کام سے یہاں آیا ہوں۔ اور میرے سر میں کیا سودا سمایا ہے۔ میں اس قطرۂ شبنم کی طرح ہوں جو راستہ کے کانٹے کی نوک پر ٹھہرا ہوا ہو یا اُس دانۂ سپند کی مثال ہوں جو انگارہ پر اپنی نشست رکھتا ہو۔

مجھے فرصت و فراغت کہاں میسّر ہے، میں نہیں جانتا کہ دفترِ تقدیر کہ کاتبوں نے میری قسمت میں کیا لکھا ہے اور میری خاک کو کس خونِ دل کے ساتھ گوندھا گیا ہے۔ کلکتہ میری آوارگی اور جادہ پیمائی کا نقطۂ آخر نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کن پہاڑوں اور بیابانوں کو طے کرنا ہے اور میرا قدم کس رہگزاروں کی طرف اٹھنے والا ہے۔ اگر دو تین ماہ میں آپ کے سایۂ دیوار میں آرام کرلوں تو کیا فائدہ۔

مرا ببین کہ چہ روزِ سیاہ در پیش است

فی الجملہ مجھ پر اس سے زیادہ اور کوئی مہربانی نہیں ہو سکتی کہ مجھے اس خرابے کے ایک گوشہ میں تنہا رہنے دیا جائے اور مجھ بے کس کو میرے حالات کی خرابیوں کے سپرد کر دیا جائے اور مجھے خاکِ مردہ کی طرح اس ویرانے میں پڑا رہنے دیں اور بس

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

اللہ بس باقی ہوس فقط۔

(اسد اللہ)

(صفر تا ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق اگست تا اکتوبر ۱۸۲۸ء)

.....

بنام خواجہ فیض الدین حیدر شائق جہانگیر نگری

باہمہ خرسندی از وے شکوہا دارم ہمی ۔۔ تا نداند صید پرسشہاے پنہانی مرا

اپنی تمام خوشیوں کے باوجود میں اس سے ہزار شکوے بھی اپنے دل میں رکھتا ہوں تا کہ وہ مجھے اپنی پرسش ہاے پنہانی کا ایک صید زبوں خیال نہ کرے۔

سرتاپا مہر ومحبت اور لطف ومجسم آپ سلامت رہیں آپ کے ضمیر روشن پر یہ بات نمودار ہوئی ہوگی کہ فلاں شخص نے بے نیازی کے شکووں کو بنیاد بنا کر دفتر کے دفتر تحریر کر دیتے ہیں اور بے موت مرنے کے غم والم کو داستان درداستان سنا دیا ہے اسی وجہ سے خط روانہ فرمایا ہے۔اور میری خاطر کو نوید خوش بختی ہے۔

ہم نے بھی شکوے سے اپنے لبوں کو گویا سی لیا ہے اور اپنی زبان کو مہربانیوں کی ستائش کے لیے کھول دیا ہے۔ پھر ہم سے کوے محبت کے خاک نشینوں کو خوش کرنا کون مشکل بات ہے۔اس کے لیے تو وہ نگاہ بھی کافی ہے جو بظاہر نگاہ سے کم ہو۔ ہم ایسے محبت کے ماروں کی خوشی وشادمانی ہی کیا کبھی کبھی پوچھ لیا جائے بس اتنا ہی کافی ہے۔

مکرمی ومحترمی مولوی سراج الدین احمد نے میرے مشفق آغا محمد حسین ہی کی زبان اختیار فرماتے ہوئے آں جناب کی طرف سے ایک باقاعدہ باب تحریر کیا ہے، یہ رخصت نہ کرسکنے کے سلسلے میں ہے اور اس صرصرِ خامہ کو میری قوتِ سماع کے حوالے فرما دیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ ہرگر نہ گزارش اور نگارش کے دائرے میں جب بھی قدم رکھتا ہوں دل کو اتنا ہی آزردہ پاتا ہوں۔

میں نے کتنا صحیح سمجھا ہے کہ یہ تغافل ارادتاً عمل میں نہیں آیا بلکہ سر کا درد رخصت کرنے میں رکاوٹ بن گیا۔اس مقدمے کے سلسلے میں میں خود اپنا گریباں گیر

ہو رہا ہوں کہ مجھے فرصت کیوں میسر نہیں ہے کہ میں آپ کے وداع ہونے کے وقت وہاں حاضر رہوں اور میری آنکھیں آپ کی ایک ایک بات کو دیکھیں اور میرے دل تک پہنچائیں۔

کاش جہانگیر نگر میں میرا کوئی دوست ہوتا کہ وہ میری بے زبانی کا وکیل بن جاتا اور میری طرف سے معذرت خواہی کی بساط بچھاتا کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ میری بے کسی پر رحم فرماتے اور میری طرف سے خود معذرت خواہ ہوتے۔

والسلام والاکرام محمد اسد اللہ

(۲ رمضان ۱۲۴۴ھ، مطابق ۸ مارچ ۱۸۲۹)

حضرت والا

خاکساروں پر نوازش کرنے والے گوہریں نامے نے شرفِ ورود سے نوازا سلامتیِ حال کی دریافت پر ایزدِ پاک کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالانا دانۂ سپند کی دہکتے ہوئے انگاروں پر بیقراری اور فریاد وزاری بالکل سامنے کی بات ہے اور ایسی روشن اور واضح حقیقتوں کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں جو آدمی آگ پر دانۂ سپند کی بقیراری کا یقین نہیں کرتا۔

اس سے کہو کہ وہ آئے اور مٹھی بھر اسپند کے دانے دہکتی ہوئی آگ پر پھینکے اور یہ دیکھے کہ یہ کس طرح تڑپتے اور اُچھلتے ہیں۔ دانۂ سپند کی بیقراری پارے کی بیقراری جیسی نہیں ہے اس کی وجہ آگ کی شدید گرمی ہے۔

کہنے والا جب اشعار کے پہلے مصرعہ کو نار کی جانب معطوف کرے جیسا کہ کہا گیا ہے ''تا دیدم روئے آتشینش'' جب سے میں نے اس کے (روئے آتش ناک

کو دیکھا ہے)۔ بے تامل مصرعہ ثانی درست جائز اور روا ہوگا۔ ''مانندِ سپند بیقرارم'' اور
اُن دونوں مصرعوں کو میں یہاں دہراتا ہوں ''مانندِ سپند برشرارم''۔ ''برشرار'' تکلف
سے خالی نہیں اور اگر پُر شرار لکھیں تو یہ خلافِ واقع ہوگا اس لیے کہ ''سپند'' جیسے ہی گرمی
یا حرارت کو اپنی ذات کے قرین محسوس کرتا ہے۔ وہ انگارے سے فوراً جدا ہونا چاہتا
ہے۔ اور جست لگاتا ہے۔ وہ اس حد سکوں و ثبات کہاں سے لائے کہ شرار کے بہ
مقابل آسکے لیکن مثل ''سیماب بے قرارم'' ''سیماب'' کی طرح میں بیقرار ہوں یہ
مصرعہ اپنے اندر کوئی عیب نہیں رکھتا لیکن مصرعہ اول کے ساتھ اسے کوئی نسبت بھی نہیں
ہے۔ اس لئے کہ ''سیماب'' آتش کے وجود کے بغیر بھی بیتاب رہتا ہے۔ اور نیز یہ
مصرعہ ''تا دیدم روئے آتشیں'' جب سے میں اس کے روئے آتش ناک کو دیکھا ہے
اپنے مقابل میں ایسی چیز کو چاہتا ہے کہ اُسے آگ کے قریب آنے پر وہ حالت پیش
آئے۔ جو قریب آنے سے پہلے اس میں موجود نہ ہو۔ بہر حال کوئی بھی صورت بجز
سپند۔ پروانہ بارود رخار و خس اور ان جیسی دوسری اشیاء کے کوئی اور شے تجویز نہیں کی
جاسکتی اور اگر کوئی یہ کہے کہ سیماب کو بھی آگ کے قریب آکر ایک نئی اور عجیب
وغریب صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے تو میں یہ جواب دوں گا کہ یہ بات ٹھیک ہے۔

لیکن وجہ شبہہ کیونکہ بیقراری ہے اور سیماب میں یہ دائمی ہے۔ کسی حالت
میں وہ اس سے الگ نہیں ہوتی اگر مصرعہ اولیٰ یہ ہے دیدم تا روئے آتشنیش''۔ مصرعہ
ثانی قید قافیہ بیقرار کے ساتھ اس سے زیادہ پُر گرم نہ ہوگا۔ ''مانندِ سپند بیقرارم''۔

فقط

''مطلع غزل جناب''

مسیح زمانست و جانِ منست ایں

همانا که روح و روانِ منست این

بہت اچھا اور بے عیب ہے، لیکن اگر جائے جان کے یہاں جہاں لاتے، تو یہ زیادہ لطیف ہو جاتا اس لئے کہ جہاں جان کے مقابلہ میں زیادہ شگفتہ اور بامعنی ہے۔ لفظِ زماں کے مقابلے میں اب آپ جیسے پسند فرمائیں۔

ہمیں خوں بہا بس بود بعدِ قتلم

چو گوئی کہ از کُشتگانِ منست ایں

یہ شعر بہت بامزہ اور مربوط ہے لیکن چو گوئی کانوں کو سننے میں تکلیف دیتا ہے اور دور از کار معنی اس سے پیدا ہوتے ہیں بے تکلف یہ آپ کیوں نہیں فرماتے:

بفرما کہ از کُشتگانِ منست ایں

(ترجمہ)۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا کہ میرے دل کا حال کیا ہے۔ میرے اس بت کی جو مجھ سے بدگمان ہے وفاداری کا یہ انداز ہے۔

اگر عالم بالا سے فکر کے قدم کچھ نیچے آ جاتے جانِ عمی؟؟؟ پر بھی غور فرمائی کی جاتی تو معلوم ہوتا کہ یہ بہت سے نازک خیالوں کے اشعار کے ساتھ پہلو بہ پہلو، واقع ہوا ہے اور اس بات کو میں کچھ اور وضاحت سے عرض کرتا ہوں۔

میرے عشق کا حاصل سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے نہ میرا دوست بے وفا ہے کہ وہ کبھی میرا حال نہ پوچھتا ہو۔ ایسی صورت میں لفظ بدگمان جو بت کی صفت کے طور پر آیا ہے، وہ 'حشوِ ملیح' درجہ رکھتا ہے اس لئے کہ اس لفظ کا معنی سے کوئی ربط نہیں بنتا آپ یہ کیں نہیں کہتے:

ادائے بتِ بدگماں نیست ایں

(ترجمہ) یہ میرے بتِ بدگمان کی ادا ہے

حاصل معنی اب یہ بات ہوگی کہ میرا معشوق بدگمان ہے اور جانتا ہے کہ میں اس جیسا عاشق نہیں ہو۔ اور اپنے آپ کو مکر و تکلف کے ساتھ اس کا عاشق صداق ظاہر آتا ہوں اس لئے وہ میرے دل کا حال نہیں پوچھتا اور یہ نہ پوچھنا اس کی ادائے بدگمانی ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ شعر تہہ داری اور استواری میں ایک عالم رکھتا ہے۔ اسے وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو طبعِ سلیم رکھتا ہو در چار شعر مع مقطع کے اگر میں سچ بولوں ضرور نگاہ میں رکھنے چاہیں اور کاغذ پر یہ ستم روا رکھا جانا چاہئے۔ ان کے بارے میں تلاش کی زحمت سے کام لیں اور پھر فرمائیں:

ہرچہ ازاں نام و نشانش دہند
جوں نہ پسندد نہ ازانش دہند

(ترجمہ) جو کچھ اس کا نام و نشان بتلایا جاتا ہے چونکہ اسے پسند نہیں کرتا تو اسے بدل کر اور کسی جہت کی تلاش کی جاتی۔

(والسلام والاکرام)

اسد اللہ

تحریر چھ ماہ صفر اور چھ بعد والا نامے کے ورود کے بعد
جمعہ سنہ ۱۲۴۵ھ/مطابق ۷ اگست
بنام خواجہ محمد حسن (۲۹/۱۴)

جنابِ عالی چونکہ میں آج ملازمانِ والا کی فرمائش کے پورا کرنے میں

مصروف رہا ہوں اگر میں خدمت میں نہ پہنچ سکوں تب بھی مجھے حاضروں میں شمار کرنا چاہیئے میں امید کرتا ہوں کہ نواب سید عالم علی خاں کے اجزائے خطاب سے آپ بذریعہ تحریر مجھے مطلع فرمائیں گے اگر زندگی باقی ہے تو میں کل دوپہر کے وقت حاضرِ خدمت ہوں گا۔ زیادہ نیاز

اسد اللہ

قبلۂ حاجات

چونکہ جنابِ والا کا سفر گڑگاواں کے راستے سے نہیں ہوا بہر حال میں یہ جانتا ہوں کہ آں جناب کو مجھ فقیر کے دیوان کا اشتیاق بیش از بیش ہے اس لئے میں نے مجبوراً اس کی التجا نواب صاحب قبلہ صاحب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر سے کی نواب صاحب ممدوح نے میرا جو دیوان بڑے شوق و ذوق سے نقل کرایا تھا میں نے اسے عاریتاً طلب کیا اللہ پاک نواب صاحب کو سلامت رکھے کہ انہوں نے اپنے ذوق کا خیال نہیں فرمایا اور وہ اجزاء مجھے عطا فرمادئے میں اس نسخہ کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں ان اجزاء کو پوری احتیاط کے ساتھ مجلد کرالیں۔ زیادہ نیاز

اسد اللہ

(عشرۂ اول ماہ رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۲ / تا ۳۱ جنوری ۱۸۳۳ء)

بنام خواجہ جمیل فخر اللہ صاحب

یا اسد اللہ الغالب با

بہ والا خدمت عالی درجت خواجہ صاحب جمیل المناقب عظیم الشان مخدوم و مطاعِ نیاز مندان خواجہ فخر اللہ صاحب زاد مجدہٗ (خواجہ فخر اللہ) کی خدمتِ والا

میں جوایک عالی مرتبہ شخص ہیں میرے مخدوم اور مرکزِ عطاعت ہیں اور بڑے خطابات وتعریفات والے ہیں۔ میرا اسلامِ نیاز ان کی نظر گاہِ والا امتیاز میں منظور و مقصود مقبول ہو)۔

قبلۂ حاجات آغازِ خط میں ایک دوست کو سراہنا اور اس کی گراں مایگی کی تعریف کرنا افسانہ گوئی و بادخوانی کے برابر ہے یہ زمزمہ تو سخن سازوں ہی کو مبارک ہو۔

نگارش نامہ میں اپنے حرفِ شوق کو تحریر کرنا شاہد معنی کے چہرہ پر نقاب ڈالنا ہے یہ شیوہ ہرزہ طرازوں ہی کے حق میں ارزانی رہے یہی بہتر ہے۔ عمدہ روش یہ ہے کہ نامہ نگار کو چاہئے کہ اس کی تحریر اس کی گفتگو سے دور نہ ہو جائے۔ کہ ان دونوں رشتوں کو پھر ایک دوسرے سے نہ ملایا جا سکے۔

اور ایک کے نقش کو دوسرے کے آئینہ میں نہ دیکھا جا سکے اس جرم میں کہ میں اپنی آنکھوں کو شاہدِ مدّعا کا آئینہ دار بنا دینا چاہتا تھا میں نے کیا کیا دِن نہیں دیکھے۔ اور اس تمنا میں کہ میں اپنی انگلیوں کو لیلیٰ مُراد کی زلفوں کا شانہ بناؤں۔

میں نے کیا کیا بلائیں زمانہ میں نہیں دیکھیں۔ میں وقت کے ظلم وستم پر نالہ و زاری کرتا اور اپنے سینہ کو تلوار کی دھار سے ملاتا ہوا کلکتہ پہنچا اور ایک لمبی مدّت تک اس بہشت جیسی آبادی میں جو اِدھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی تھی میں کس طرح امید و بیم کی کشاکش میں مبتلا رہا۔

بعد ازاں اس دعا کی طرح جو نامقبول ہو میں واپس لوٹا اور ناخواندہ بلاؤں اور اچانک نازل ہونے والی وباؤں کی طرح اپنے وطن واپس آیا۔ حکّامِ ستم پیشہ کو

اپنے دشمن کے ساتھ دوستی کرتے ہوئے دیکھنا اور سر رشتۂ کار کا ہاتھوں سے چھٹ کر گم ہونا اور آبگینۂ تدبیر کا پتھر سے ٹکرانا اور شیشہ کے ٹکڑوں کا پیروں کے نیچے آنا۔ یہ سب میری روداد کا حصہ ہے۔

''مسٹر اسٹرلنگ'' کی اچانک موت جس کو مرگِ ناگہاں کہنا چاہیئے۔ یہ مقدمہ کے آغاز میں ہوگیا اور مولوی محمد حسن کا درمیاں سے غائب ہونا۔ عین اس وقت جب کہ نالہ وفریاد کا دورِ آخر تھا۔ طرح کے عوارض کا پیش آنا۔ صورتِ حال کا بگڑنا تمام کیئے دھرے پر پانی پھر جانا، طوفان کی موجوں اور اس سیل بیکراں کی کشاکش میں پڑنا۔ یہ اس طرح کے حوادث تھے کہ ان کو بیان کرنا اور صفحۂ قرطاس پر اِن کے عکس کو اتارنا ایک آدھ وَرق پر تو کیا ہزار صفحات پر بھی ممکن نہیں۔

مخدومی خواجہ محمد حسن نے اس نامہ نگار کی قسمت کے روز سیاہ کو دیکھا ہے اور وطن میں رہتے ہوئے میرے غریب الوطن ہونے کا تماشا ان کی نظر میں ہے۔ میرا دل فرنگیوں کی بے وفائی سے بے حد دکھی ہے۔ اس طبقہ کی ناانصافیوں سے میں بے طرح آزردہ خاطر ہوں۔

میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہندوستان کے جاہ مندوں میں سے کوئی میرے حال پر توجہ فرما ہو۔ اور نگاہِ داری کے قاعدہ اور مرتبہ شناسی کے قانون کے ساتھ مجھے دعوت دے تو میں اپنا دل اس کے طرۂ دل آویز پر نچھاور کردوں۔ اور رفتہ سفر باندھ کر اس کے سایہ ودیوار میں جا کر بیٹھ رہوں اور قلندرانہ اِس تاریک خاک داں سے گزر جاؤں اور دیس بہ دیس پھروں اور دنیا کی اس سرے سے دوسرے سرے تک سیر کروں۔ کبھی شیراز کے آتش کدوں کا طواف کروں اور کبھی میخانۂ شیراز کے دروازوں

پر دستک دوں میرے شوق نے اس پردہ میں بہت رنگ و آہنگ کے ساتھ بہت سے شعر کہے ہیں۔

اے غالبؔ ہندوستان سے نکل جا اور اس فرصت کو غنیمت سمجھ نجف میں موت کا استقبال کتنا اچھا ہے اور ''صفہان'' میں زندگی گزارنا کتنا بھلا لگتا ہے:

غالب از ہندوستان بگریز، فرصت مفتِ تست
در نجف مردن خوش است و درصفاہان زیستن

میں نے چند سطریں صنعتِ تعطیل میں اپنے قلم سے صفحہ کاغذ پر آراستہ کی ہیں اور میرا دل اپنی ہوسنا کیوں کے باعث اس آرزو پر مٹا ہوا ہے کہ اس وَرق کا عنوان نگاہِ معلیٰ القاب سیدِ عالم اور قبلۂ عالم کے نور سے فروغ پذیر ہو۔ اگر غالبؔ کی نیازمندیوں اور خاکساروں کا نقش بے نیازیوں کی صَرصَرِ نے مٹا نہ دیا ہو، زمانۂ فراق کے طولِ ناروائے حرفِ وفا کو خاطرِ عاطر کے صفحہ سے محو نہ کر دیا ہو۔

میری اس ہمت افزائی سے دریغ نہ فرمائیں۔ والسلام والاکرام از اسد اللہ نگاشتۂ دہم رمضان ۱۲۴۱ ہجری۔

(۱۰ رمضان ۱۲۴۸ھ، مطابق ۳۱ر جنوری ۱۸۳۳ء)

(تمام شُد کارِ املا بہ وقتِ شام سوا سات بجے، ۲۴ر ماہِ جون ۱۹۹۸ء، بہ دستِ عشرت جہاں ہاشمی۔)

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں